نومبر ۲۰۰۷ء

قومی زبان

بیادِ علامہ محمد اقبالؒ

سرسید احمد خاں، حالات وافکار

[redacted]ے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

بابائے اردو، سرسید احمد خاں کے شاگرد خصوصی تھے۔ اسی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ جس طرح اُنھوں نے سرسید احمد خاں کو چلتے پھرتے تاریخی، علمی کارنامے انجام دیتے ہوئے دیکھا ہے اس سے نئی نسل کو بھی اُسی انداز میں آگاہ کریں۔

قیمت: ۷۵ روپے

انجمن ترقی اردو کا المیہ

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کی باقیات کو دہلی سے لاکر کراچی میں مجتمع کیا اور انجمن کے بے جان اور ناتواں جسم میں ایک نئی روح پھونکی۔

۱۹۴۹ء میں اردو کالج قائم کیا۔ بعد میں اردو کالج کے پرنسپل اور اُن کے نامزد کیے ہوئے شرکائے کار نے بابائے اردو کے خلاف جو سازشیں اور غیر اخلاقی وغیر انسانی برتاؤ کیا وہ قابلِ مذمت ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے بقلم خود اس کا تفصیلی احوال بڑے کرب کے ساتھ بیان کیا ہے۔

قیمت: ۷۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

ماھنامہ

قومی زبان

کراچی

بانی: بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

جاری شدہ: پاکستان میں ۱۹۴۸ء

قومی زبان، نومبر ۲۰۰۷ء، جلد ۷۹، شمارہ: ۱۱

ادارۂ تحریر

ادا جعفری

جمیل الدین عالی

مُدیر

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں

بدل اشتراک

فی پرچہ ——— ۱۰ روپے

سالانہ عام ڈاک سے — ۱۱۰ روپے

سالانہ رجسٹری سے — ۲۳۰ روپے

بیرونِ ملک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ/۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ/۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اُردو پاکستان

شعبۂ تحقیق و تالیف و تصنیف

ڈی-۱۵۹، بلاک ۷، گلشنِ اقبال

کراچی ۷۵۳۰۰

فون: ۴۸۱۱۴۰۶-۴۹۷۳۲۹۶

مضمون نما

اقبال، عشق و نظریہ تحرک	ڈاکٹر اشرف کمال	۵
اقبال اور جدیدیت	ناصر عباس نیر	۱۳
فیضانِ اقبال کی ایک روشن مثال	ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان	۲۱
اقبال کا تصورِ اسلام	سید اظفر رضوی	۲۵
کلامِ اقبال میں فکری و فنی ہم آہنگی	رابعہ سرفراز	۴۴
فکرِ اقبال کے ترقی پسندانہ زاویے	ڈاکٹر طاہر تونسوی	۵۰
اقبال پھر اقبال ہے	کیفی حسینی	۵۵
ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار....	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	۶۲
۲۰۰۶ء کی اہم ادبی کتابیں۔ ایک جائزہ	ڈاکٹر اسد فیض	۶۷
بیاضِ سحر — ایک گم شدہ ناول	انور سدید	۷۷
رفتارِ ادب	.....	۸۱
گردوپیش	.....	۹۳

کھانسی، نزلہ، زکام

کسی موسم یا کسی وقت کے پابند نہیں

ہمدرد کی مجرّب دوائیں ان کا علاج بھی ہیں اور ان سے محفوظ رہنے کی مؤثر تدبیر بھی

سُعالین

مُفید جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ سُعالین، گلے کی خراش اور کھانسی کا آسان اور مؤثر علاج۔ آپ گھر میں ہوں یا گھر سے باہر، سرد و خشک موسم یا گرد و غبار کے سبب گلے میں خراش محسوس ہو تو فوراً سُعالین لیجیے۔ سُعالین کا باقاعدہ استعمال گلے کی خراش اور کھانسی سے محفوظ رکھتا ہے۔

جوشینا

نزلہ، زکام، فلو اور اُن کی وجہ سے ہونے والے بخار کا آزمودہ علاج۔
جوشینا کا روزانہ استعمال موسم کی تبدیلی اور فضائی آلودگی کے مضر اثرات بھی دُور کرتا ہے۔
جوشینا بند ناک کو فوراً کھول دیتی ہے۔

لعوق سپستاں

نزلے زکام میں سینے پر بلغم جم جانے سے شدید کھانسی کی تکلیف طبیعت نڈھال کر دیتی ہے۔
اس صورت میں صدیوں سے آزمودہ ہمدرد کا لعوق سپستاں، خشک بلغم کے اخراج اور شدید کھانسی سے نجات کا مؤثر ذریعہ ہے۔
ہر موسم میں، ہر عمر کے لیے

صُدوری

مؤثر جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ خوش ذائقہ شربت۔ خشک اور بلغمی کھانسی کا بہترین علاج۔ صدوری سانس کی نالیوں سے بلغم خارج کر کے سینے کی جکڑن سے نجات دلاتی ہے اور پھیپھڑوں کی کارکردگی کو بہتر بناتی ہے۔ بچوں، بڑوں سب کے لیے یکساں مُفید۔

شوگر فری صُدوری بھی دستیاب ہے۔

سُعالین، جوشینا، لعوق سپستاں، صُدوری۔ ہر گھر کے لیے بے حد ضروری

ہمدرد

مدینۃ الحکمہ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔
آپ ہمدرد دوست ہیں۔ اعتماد کے ساتھ مصنوعاتِ ہمدرد خریدتے ہیں۔ ہمارے منافع مدینۃ الحکمہ شہرِ علم و حکمت کی تعمیر میں لگ رہا ہے اس کی تعمیر میں آپ بھی شریک ہیں۔

ہمدرد کے متعلق مزید معلومات کے لیے ویب سائٹ ملاحظہ کیجیے:
www.hamdard.com.pk

Adarts-SJLS-1/2001

اداریہ

یہ نومبر کا مہینہ ہے یعنی اقبال کا مہینہ ہے۔ ان کا یہ کمال کا شعر یاد آیا:

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہ ہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

روز ازل سے یہ ہو رہا ہے کہ جب دور بدلتا ہے، تاریخ نئی کروٹ لیتی ہے، نیا سماج ظہور میں آنے لگتا ہے، روایتوں کے سانچے ٹوٹنے لگتے ہیں، نئی سوچ جنم لینے لگتی ہے تب لوگ نئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے میں مشکل محسوس کرتے ہیں اور زندگی کے تمام شعبوں میں روایت اور جدت کے علم برداروں میں کھنچا تانی شروع ہو جاتی ہے۔ اقبال پڑھیں کہ انتہائی بالغ نظر شاعر و فلسفی تھے بلکہ دانائے راز تھے اس لیے انھوں نے قوموں کی زندگی کی اس مشکل کو شدت سے محسوس کیا اور اس شعر کو تخلیق کر کے ہمارے اذہان سے بے جا ضد اور ہٹ کی گرد ہٹانے کی کوشش کی۔ سرسید اور دیگر دانشور بھی طرز کہن پر اڑنے کے مخالف تھے۔ طرز کہن پر اڑنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ہم جامد نظریات سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا پاتے اور زمانہ جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے اسے روکنے کی ناکام سعی کرتے ہیں بلکہ متحارب گروہ کا روپ دھار کر فکری و عملی انتشار کو جنم دیتے ہیں۔ یوں ہم ترقی کی رفتار کو روکنے کی کوششیں کرتے ہیں جس سے بے شمار سماجی، معاشرتی، اخلاقی اور معاشی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت ایسی تمام قوتیں معاشرے کو پیچھے کی طرف لے جانے کی کوششوں میں مصروف نظر آتی ہیں۔ ایسے میں یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ آئین نو کے حامی گویا دین، تہذیب اور معاشرت کے دشمن ہیں۔ ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اقبال جب طرز کہن کو نشانہ بناتے ہیں اور نئی منزلوں اور نئے امکانات کی جانب اشارہ کرتے ہیں تو اخلاقی نظام کو ہر صورت میں مربوط رکھنے کی حمایت کرتے ہیں تاکہ معاشرہ کی بنیاد مستحکم رہے۔ آج نظریاتی و فکری انتشار کی حدیں وسیع ہو رہی ہیں، ایسے میں بلاشبہ اقبال جیسے جلیل القدر فلسفی کی فکر پر عمل کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

اہم اعلان

ہم عنقریب ''قومی زبان'' کا ''قرۃ العین حیدر نمبر'' شائع کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں لکھنے والوں سے مودبانہ درخواست ہے کہ وہ ان کے فن اور شخصیت پر ہمیں جلد از جلد مضامین فراہم کریں۔ جن ادیبوں کے پاس محترمہ قرۃ العین حیدر کے خطوط ہیں اُن سے علاحدہ درخواست ہے کہ ان کی عکسی نقول سے نوازیں۔ اس کرم گستری کے لیے ہم ممنون رہیں گے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال،

کراچی۔۷۵۳۰۰

اقبال، عشق و نظریہ تحرک

ڈاکٹر اشرف کمال

عشق انسان اور کائنات کے اندرونی ارتقا میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے کائنات کی ہر شے میں عشق کی جلوہ گری نظری آتی ہے۔ عشق ایک مکمل فلسفۂ حیات کا نام ہے جو انسانی جذبوں اور لطیف احساسات کو زندگی کی تابندہ و پائندہ بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ عشق آفاقی اور عالمگیر قدروں کی نگہبانی کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے زمان و مکان کی بندشوں اور نسل و نسب کی پابندیوں سے نجات کی نوید سناتا ہے۔ عشق انسان کو یاس و ناامیدی کے وسیع و عریض، لق و دق صحرا سے نکال کر امیدوں کے نخلستان میں پہنچا دینے کی صلاحیت رکھتا ہے بعض لوگ عشق کو پیار محبت اور بسا اوقات مرد و زن کے باہمی تعلقات سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک عشق انسان کو نکما اور بے کار بنا دیتا ہے اور انسان عشق میں گرفتار ہونے کے بعد ہر وقت تصورات میں کھویا اور خیالات میں الجھا رہتا ہے۔ اس طرح وہ عملی طور پر ناکارہ ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ جنسی بے راہ روی کو بھی عشق کے مترادف سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال عشق اخلاق انسان اور معاشرے میں بگاڑ کا سبب بنتا ہے لیکن حکیم الامت علامہ اقبال نے عشق کو جو معانی پہنائے ہیں ان میں بے پناہ وسعت، گہرائی اور جامعیت ہے۔ اقبال کا بنیادی فلسفہ عشق ہی کے گرد گھومتا ہے۔ ان کا فلسفہ خودی اور مرد مومن کا نظریہ بھی عشق کے فلسفہ سے توانائی حاصل کرتا ہے۔ عشق ہی کامیابیوں اور کامرانیوں کے حصول کے لیے زینے کا کام دیتا ہے۔ عشق کے ذریعے انسان حیاتِ ابدی کی سرمستیاں حاصل کرتا ہے اقبال عشق سے تسخیرِ کائنات کا کام لیتا ہے اور دوسرے شاعروں کی طرح نام نہاد رسمی عشق کا قائل نہیں ہے بلکہ اس کے ہاں عشق زندگی کا ایک زبردست محرک ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''اقبال کے ہاں عقل اور عشق دونوں مقصود بالذات نہیں بعض اوقات ایسا ضرور لگتا ہے کہ وہ عشق کو مقصود بالذات کہہ رہے ہیں مگر دراصل یہ عشق کے لفظ کو اس کے اصل مفہوم سے منقطع کر کے ایک وسیع تر مفہوم سے منسلک کرنے کے مواقع پر یہی محسوس ہوتا ہے مثلاً جب وہ کہتے ہیں کہ خودی عشق کے مترادف ہے (بالِ جبریل، ص ۱۷۴) اور اس سے عشق اور خودی کا وہ فرق جو مسافر اور منزل کا فرق ہے گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اقبال کے ہاں عشق ذوقِ تسخیر کا نام ہے۔ خودی سے

مراد آ گہی یا خود آ گاہی ہے رہا حسن تو وہ واپنی حیثیت سے کہیں بھی دست کش نہیں ہوتا۔(۱)

اقبال کے نزدیک عشق ایک ایسا جذبہ ہے جو حیات انسانی کے لیے ناگزیریت کا درجہ رکھتا ہے۔ کائنات کی کوئی بھی شے حتیٰ کہ ایک بھی ذرہ اس عظیم جذبے سے خالی نہیں ہے۔ ممتاز حسن لکھتے ہیں:

''عشق زندگی کے بنیادی حقائق میں سے ہے اس کا پیغام زندگی ہے اور اس پیغام کے پہنچانے والے کو میں پیغمبر کہتا ہوں۔ میں نے یہ سب کچھ اس امر کے کے واضح کرنے کے لیے کہا ہے کہ میں نے لفظ ''پیغمبر'' کو کسی طرح بھی کوئی مذہبی رنگ نہیں دیا، نہ اسے کبھی مشکوک مفہوم ہی میں استعمال کیا ہے۔ میرا مطلب بالکل صاف ہے۔ اقبال کو پیغمبر کہنے سے میری مراد یہ ہے کہ اقبال نے زندگی کے بنیادی حقائق کو ہمارے سامنے پیغام کی صورت میں پیش کیا ہے اور ہمارے لیے ایک مخصوص راہِ عمل منتخب کی ہے۔''(۲)

عشق ایک سعی مسلسل، ایک جدوجہد اور تحرک کا نام ہے۔ انسانی زندگی، پوری کائنات اور نظامِ عالم اسی تحرک پر قائم ہے۔ دنیا میں کوئی بھی کام بغیر تحریک کے ممکن نہیں اور اس تحرک کو عمل میں لانے والا جذبہ عشق کہلاتا ہے۔ یہی جذبہ عشق انسان کو منزلیوں پہ منزلیں مارنے کا عزم اور مقصدِ حیات حاصل کرنے کی بشارتیں عطا کرتا ہے:

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبدم
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

اقبال نے عشق کے نظام و جذب و کشش کو ایک نیا اور وسیع تر فلسفیانہ مفہوم عطا کیا ہے۔ انھوں نے تاریخی شعور سے کام لیتے ہوئے اپنی فکر کو مستحکم بنیادیں فراہم کی ہیں۔ ان کی فکر ایک متحرک قوت ہے جس نے زندگی میں حرکت کے تصور کے اہمیت دینے کے ساتھ ساتھ خود ایک متحرک کائنات کے مثبت نظریہ سے روشنی پائی ہے۔(۳)

عشق ناممکن کو ممکن بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ عشق پتھروں سے گیت کشید کرنے کی اہلیت سے بہرہ مند ہے اور یہ سخت سے سخت دلوں میں اتر کر رنگین نغمے اور خوش ادا صدائیں برآمد کر لیتا ہے۔ اسی لیے مسندِ شایانہ اور تخت و تاج کو ٹھوکر مار کے حلقۂ عشق میں آنے پر فخر محسوس کیا جاتا ہے۔

حسن بندۂ آزادم عشق است امام حسن
عشق است امام من عقل است غلام حسن

اقبال کے نزدیک عقل انسان کو فطرت اور کائنات کی غلام بنا دیتی ہے جب کہ عشق انسان کو تمام پابندیوں سے چھٹکارا دلا کر

اسے رنج ولحن سے دور کر دیتا ہے۔ عشق فقط نظارۂ جمال نہیں بلکہ یہ ایسی چیز ہے جو کائنات کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ عشق جمال وجلال دونوں کے ادراک کا نام ہے علامہ اقبال کے نزدیک عشق میں ایسی طاقت اور قوت پوشیدہ ہے جو کائنات اور فطرت کے سربستہ زاروں اور چھپے ہوئے اسرار سے پردہ اٹھانے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ عشق انسان کو ایسا پاکیزہ اور روحانی جذبہ عطا کرتا ہے جو اسے اعلیٰ مقاصد کے حصول میں ایک عالمگیر رشتے میں باندھ دیتا ہے۔ عشق اپنے راستے میں حائل ہر رکاوٹ کو دور کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ عشق ارادوں کو ولولوں میں تبدیل کرتا ہے اور امنگوں کو ایک نئی ترنگ دیتا ہے۔ عزیز احمد لکھتے ہیں:

> ''عشق کا جو تصور اقبال کے ذہن میں ہے وہ ایک مستقل اور عظیم الشان حقیقت کا تصور ہے اور اس حقیقت کی جستجو اور اس کو دیکھنے اور اس تک پہنچنے کی کوشش اس امر کو ظاہر کرتی ہے کہ شاعر کی ہستی اس حقیقت کے بالکل الگ ہے۔ وہ دور سے طور کے شعلوں کو دیکھ رہا ہے اور ان تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔'' (۴)

عشق دراصل وہ طاقت ہے جو عاشق کو اس کی منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے کی مطلوبہ توانائی فراہم کرتی ہے عشق انسان کو مرکزِ آرزو کے گرد طواف پر اکساتا ہے۔ یہ ایک حرکی جذبہ ہے جو جمود اور یکسانیت کے متضاد ہے۔ یہی جذبہ اس کائنات کی تعمیر وتشکیل کی اصل روح ہے:

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو رازِ زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

اقبال کے نزدیک عشق سوز وتب وتابِ جاودانہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور عشق کا یہ سوز اور تڑپ اقبال کے مردِ مومن ہی میں اپنی انتہا کو پہنچتی ہے گویا مردِ مومن ہی کائنات کی تڑپ کا نمائندہ ہے (۵) اور یہ تڑپ عشق کی پیدا کردہ ہے یہ تڑپ ہی زندگی کا دوسرا نام ہے۔ ڈاکٹر تاثیر لکھتے ہیں:

> ''اقبال کی شاعری کا پہلا اور آخری وصف زندگی ہے اس کی نظموں کا ہر مصرعہ اس کے فلسفہ کا ہی صیغہ روحِ حیات سے لبریز ہے۔ اس کی رگوں میں خون وجدان حیات کی مسرت سے رقص کناں ہے۔'' (۶)

اقبال کا عشق انھیں عشقِ رسول تک لے جاتا ہے یہ عشق ان کے قلب وجگر میں اطمینان اور سکون کا باعث ہے۔ ان کے ہر شعر میں دل میں موجود دھڑکنوں کی طرح عشق کی لے کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال عشق کو ایک نصب العین کے طور پر اختیار کرنے پر زور دیتے ہیں:

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اقبال مقاصد کی لگن کو عشق کے مفہوم کے طور پر پیش اور استعمال کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عشق انسانی فطرت اور کائناتی مظہر کا لازمی جزو ہے اور یہ ایک اضطراب انگیز ذوقِ وجدان ہے جو انسان کو اور کائنات کی ہر شے کو مسلسل حرکت میں رکھتا ہے یہ حرکت پذیر جذبہ عشق کہلاتا ہے:

عشق کے مضراب سے نغمہ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

عشق فطری تڑپ اور لگاؤ کا نام ہے جو انسانی دلوں میں سوز و گداز، جستجو و تلاشِ حق پیدا کر کے ان کی اہمیت کو دوچند کر دیتا ہے۔ عشق کی وارداتیں شروع دن سے انسان کے ساتھ ہیں۔ عشق کی داستان اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ تاریخ انسانی۔ عشق انسانی جبلّت کا ہی ایک حصہ ہے اور زندگی کے لیے ایک تحرک کا کام کرتا ہے۔ بڑے بڑے نامور ماہرین فلسفہ نے عشق کی حقیقت سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے یہ موضوع ہر دور میں زیر بحث رہا ہے۔ علامہ اقبال کی ابتدائی شاعری کو دیکھا جائے تو وہ عشقِ مجاز کی رنگینیوں سے منور نظر آتی ہے لیکن آہستہ آہستہ وہ عشق حقیقی کی طرف اپنا سفر شروع کرتے ہیں مجموعی طور پر ان کی شاعری مجاز و حقیقت دونوں سے مزین ہے۔

اگر ہم اقبال کی شاعری کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ساری شاعری فلسفہ خودی کے گرد گھومتی ہے اقبال کے تصور عشق کو ان کے تصور خودی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کے نزدیک عشق ہی خودی کی تربیت کر سکتا ہے۔ عشق کے بغیر خودی نہ تو پروان چڑھ سکتی ہے اور نہ ترقی کر سکتی ہے۔ علامہ اقبال کا عشق نہ تو صوفیانہ طرز کا ہے کہ خود کو بالکل مٹا کر رکھ دے اور نہ ہی وہ مجازی ہے جو بالکل ادنیٰ اور مادی چیزوں کے لیے بے قرار ہو جائے۔ بلکہ اقبال کا عشق خودی کو استوار کرنے کا ایک وسیلہ ہے جو انسان کو اعلیٰ مقاصد کے حصول میں مدد دیتا ہے:

جوہرِ زندگی ہے عشق، جوہرِ عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگیِ نیام ابھی

عشق صرف قلب انسانی ہی میں موجزن نہیں ہے بلکہ یہ چرند پرند، زمین آسمان، سورج چاند، ستاروں سیاروں یہاں تک کہ ذرے ذرے میں سمایا ہوا ہے۔ عشق ہی زندگی ہے اور عشق ہی زندگی کا حاصل ہے۔ آدمی عشق کے طفیل امر ہو جاتا ہے:

مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام

علامہ اقبال کی شاعری میں عشق جوشِ وجدان کا دوسرا نام ہے۔ یہ جوشِ وجدان انسانوں کو ذوقِ عمل اور پیہم عمل پر اکساتا ہے۔ جس انسان کے دل میں ایک بار جذبۂ عشق پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اس کی زندگی بے سمت نہیں رہتی بلکہ اس کی نظر میں اپنے مطمع حیات پر جم جاتی ہیں اور وہ اپنی منزل کے حصول کے لیے کوشاں ہو جاتا ہے ڈاکٹر مس عصمت ناز لکھتی ہیں:

''اقبال کی زندگی کا نصب العین زندگی کی گہرائیوں میں انقلاب پیدا کرنا ہے پہلے وہ انسانوں کے

ضمیر میں اپنا 'عالم نو' تشکیل کرنا چاہتے ہیں اور پھر انھیں یقین ہے کہ ان کی سوز دروں میں ڈوبی ہوئی
آواز ایک نئے انقلاب کا پیش خیمہ ہوگی۔'' (۷)

علامہ اقبال کے ہاں یہ انقلاب جس، کے لیے وہ تعمیر خودی اور جذبۂ عشق سے سرشاری پر زور دیتے ہیں، دراصل انھی مقاصد اور اہداف کا حصول ہے جو انسان کو خدا نے اور انسانی جبلّت نے تفویض کیے ہیں اور جن کے حصول کی سعی انسانی فطرت اور سرشت کا خاصہ ہے اور جو بقائے انسانی اور ارتقائے انسانی کے لیے لازمی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''اقبال کے نزدیک یقین کا محکم ترین ذریعہ عشق ہے اور اسی لیے وہ تسخیر کائنات اور تکمیل خودی کے لیے عشق کو رہنما بتاتے ہیں عقل کو کمزور وسیلہ اس لیے بھی قرار دیا ہے کہ یہ خودی کے اس عظیم مقصد کو پورا نہیں کرتی جس سے خودی کا ارتقا ممکن ہو۔ خودی کے ارتقا کے لیے تخلیقِ آرزو بنیادی چیز ہے۔ عشق میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنے لیے نت نئی آرزو پیدا کرتا ہے۔' (۸)

اقبال کے ہاں تصور عشق کے زمرے میں جدائی، فراق اور ہجر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عشق اطمینان کے اندر بے اطمینانی پیدا کرنے سے ارتقا پذیر ہوتا ہے۔ عشق جدائی کی آگ میں تپ کر کندن بن جاتا ہے۔ ذوقِ طلب اور سوزِ جدائی کی بنا پر ہی انسان نہ صرف اس کائنات کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھانے میں کامیاب ہوتا ہے بلکہ اس کی اپنی ذات بھی اسی عمل کے دوران اس پر عیاں ہو جاتی ہے۔ جدائی میں جذبات مہذبانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں اور عشق کو وہ ارفع و اعلیٰ مقام حاصل ہو جاتا ہے جہاں جدائی کا شعور اور حرمان کا احساس پہلے کسک اور پھر ایک خاص قسم کی لذت اور سرور و تسکین میں ڈھل جاتا ہے:

گرمی آرزو فراق! شورش ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق، قطرے کی آبرو فراق

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو! ہجر میں لذت طلب

فارسی اور اردو شعرا کے ہاں عشق اور عقل ایک دوسرے کے حریف کے طور پر نظر آتے ہیں لیکن اقبال کی شاعری میں صورت حال اس سے کچھ مختلف ہے۔ اقبال نے اس تضاد کو ختم کر کے رکھ دیا۔ عشق اختیار کر کے عقل کو تابع رکھ کر انسان بڑے بڑے معرکے سر انجام دے سکتا ہے اور اس کے عمل میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وسعت اور گہرائی کا اظہار و ادراک لفظوں اور حرفوں میں ممکن نہیں۔ عقل ہمیں راستے کی مشکلات سے آگاہ کرتی ہے۔ منزل کا سراغ دیتی ہے لیکن منزل تک پہنچانے میں قاصر ہے۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

علامہ اقبال کے نزدیک جو شے عمل پر آمادہ کرنے والی ہے اور انسان کو حوصلوں کی کمک عطا کر کے اس میں منزل تک پہنچنے کا جوش و خروش پیدا کرنے والی ہے وہ جذبہ ہے اور عشق و ایمان سے بڑھ کر کوئی جذبہ نہیں ہے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

عشق جذبوں کو ولولوں میں بدل دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ عشق سرخروئی کی بشارت سے عبارت ہے جب کہ عقل حصولِ مقاصد کی مبارک ساعتوں سے محروم رہتی ہے۔ عقل منزل دیکھ سکتی ہے لیکن اسے پالینے کی طاقت صرف عشق کے پاس ہے۔ زندگی کی ساری گہما گہمی اور رونقیں عشق کے دم قدم سے ہیں:

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

عشق مادی وسائل سے بے نیاز ہوتا ہے۔ صرف ۳۱۳ آدمی غزوہ بدر میں ہزاروں کفار سے ٹکرا گئے۔ قوتِ عشق و ایماں ہی انھیں کامرانی سے ہمکنار کرنے والی تھی۔ کائنات کی تمام رنگینی اور تازگی اسی جذبے سے قائم و دائم ہے۔ عشق کے اثر سے ہر چیز تحرک پذیر ہے۔ عشق جمود اور سکوت کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ عشق انسان کو لازوال بنا دیتا ہے۔ یہ سچ اور فطرت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ تاریخ کی سرشاریاں اور سرفروشی کی کہانیاں عشق ہی کی وجہ سے امر بن گئی ہیں۔ ڈاکٹر محمد امین لکھتے ہیں:

''زندگی مسلسل حرکت کا نام ہے۔ معاشرے میں تبدیلی ناگزیر ہے اور ثقافتی عمل جامد نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں اجتہاد سے کام لیا جاتا ہے۔ اقبال نے اسے اصولِ حرکت کہا ہے اور میں اسے تہذیبی و ثقافتی عمل کہتا ہوں۔ ہم انجذاب کی بجائے اجتہاد کے قائل ہیں اجتہاد ایک شعوری عمل ہے یعنی ہم رد و قبول، عقل و شعور کی روشنی میں کرتے ہیں۔''(۹)

اقبال زندگی کو حرکت سے تشبیہ دیتے ہیں، ان کے نزدیک حرکت زندگی ہی کا دوسرا نام ہے۔ جمود اور سکوت زندگی کی علامت نہیں ہو سکتے۔ ذوقِ طلب اور سفرِ شوق انسان کو کہیں رکنے نہیں دیتے ہیں اسے پیدائش سے موت تک متحرک رکھتے ہیں اس تحرک میں عشق اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ اور انسان کو جہدِ مسلسل پر اکساتا رہتا ہے۔ ممتاز حسن لکھتے ہیں:

''شخصیت کی تربیت اور پرورش زندگی کا سب سے بڑا فرض ہے۔ خودی عشق سے مضبوط ہوتی ہے۔
عشق کے معنی ہیں اقرار اور مقاصد کی مسلسل تخلیق اور ان کے حصول کے لیے مسلسل جدوجہد۔''(۱۰)

عشق انسانی زندگی کی بقا کے لیے ناگزیر ہے۔ عشق انسانی دلوں میں لطیف جذبات و احساسات پیدا کرنے میں اہم کردار کا حامل ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی اور مشینوں کی حکمرانی نے انسانی رویوں کو بہت ہی بری طرح متاثر کیا ہے۔ اور یہ صرف اور صرف جذبۂ عشق سے محرومی کی وجہ سے ہوا ہے اصل لطف اور حقیقی سرور تسکین عشق کے بغیر ممکن نہیں۔ عشق اور سچی لگن انسان کو حقیقی ترقی کی بلندیوں پر

پہنچا سکتی ہے۔

بچشم عشق نگر تا سراغ او گیری
جہاں چشم خرد سیمیا و نیرنگ است

جوش و ولولہ ہی انسانی زندگی کا اصلی جوہر ہے۔ اگر انسانی جسم میں سے یہ جوہر نکال لیا جائے تو وہ زندہ لاش کی صورت اختیار کر جائے گا۔ کچھ نہ کچھ کرتے رہنا، مسلسل تخلیقی عمل میں مصروف رہنا ہی اصل زندگی کا نام ہے ممتاز حسن لکھتے ہیں کہ:

''انسانی شخصیت کی بنیاد ایک تناؤ کی کیفیت پر ہے۔ جب تک یہ تناؤ قائم ہے زندگی بھی قائم ہے۔ زندگی کا تقاضا ہے ایک مسلسل جدوجہد، ایک اضطراب، ایک بے قراری جو انسان کو ہر وقت تخلیقِ نو پر مائل بلکہ مجبور رکھے۔'' (۱۱)

علامہ اقبال مسلمانوں کو متحرک کر کے ان میں تخلیقی اپج اور تعمیری صلاحیتوں کو جلا بخشنا چاہتے ہیں وہ بے مقصد تحرک کے قائل نہیں ہیں بلکہ کسی مقصد یا نصب العین کے حصول کے لیے انسان کو مصروفِ عمل دیکھنا چاہتے ہیں۔ ممتاز حسن لکھتے ہیں:

''اقبال کے نزدیک انسانی زندگی محض حرکت سے مطمئن نہیں ہو سکتی اس کا مقصد تخلیقی ہے۔'' (۱۲)

علامہ اقبال کی تمام شاعری ذوقِ عمل کی سرمستیوں کی ترجمان ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں نہ صرف عہد حاضر کے تقاضوں کو مدنظر رکھا ہے بلکہ ان کی نظریں ماضی اور مستقبل دونوں میں جھانک کر دیکھنے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور تھیں۔ ڈاکٹر مس عصمت ناز لکھتی ہیں کہ:

''اقبال کا فکر و فن تاریخ، سیاست اور ادب پر یکساں اثر انداز ہوتا ہے۔ آپ نے شاعری میں تاریخی شعور کو داخل کر کے زندگی اور شاعری دونوں کے آفاق کو حیرت انگیز طور پر وسیع کر کے اسے رفعت و شکوہ عطا کیا۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ شعور و احساس، فہم ادراک اور تلاش و جستجو تخلیق و تحقیق کے لیے لازمی اور ضروری ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ شاعر کی ذات بھی ارتقائے عمل میں ایک اکائی کی صورت نظر آتی ہے۔ کیوں کہ ماضی، حال اور مستقبل میں، عالم روزگار میں حادثات و انقلابات ترقی اور آگے بڑھنا ایسا عمل ہے جس کو شاعر اپنے وجدان کی مدد سے دیکھتا ہے۔'' (۱۳)

اقبال کی شاعری اور زندگی میں فکری سطح پر کوئی تضاد نہ تھا ان کا کلام ملت اسلامیہ کے لیے ایک آفاق گیر پیغام تھا۔ عشق اپنے تمام وابستگان کو فتح و سرخروئی کی بشارت عطا کرتا ہے۔ زمان و مکان کی تمام کہانیاں اور زندگی کی تمام قدریں عشق سے منسوب ہو کر زندہ جاوید ہو جاتی ہیں۔ علامہ اقبال عشق کو ایک مقدس فرض اور لطیف جذبہ سمجھتے ہیں جو دنیا کی چھوٹی چھوٹی قدروں سے بالاتر ہے عشق منزل کی راحت، آسودگی اور سکونِ قلب سے قطعی بے نیاز ہے۔ عشق جلنے پگھلنے اور مسلسل تڑپنے اور کسک کا نام ہے۔

حوالہ جات

(۱) وزیر آغا ڈاکٹر، تصورات عشق وخرد اقبال کی نظر میں، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۱۹۷۷ء، ص ۱۷۶
(۲) محمد معز الدین ڈاکٹر (مرتب)، علامہ اقبال ممتاز حسن کی نظر میں، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۸۸
(۳) حنیف فوق، ڈاکٹر، جہان تازہ، افکار، کراچی (نذر اقبال)، اپریل مئی ۱۹۶۹ء، ص ۳۲
(۴) عزیز احمد، اقبال کی شاعری میں حسن و عشق کا عنصر مشمولہ اقبالیات کے نقوش مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۱۹۷۷ء، ص ۵۵۶۔۵۵۷
(۵) وزیر آغا ڈاکٹر، تصورات عشق وخرد، اقبال کی نظر میں، ص ۱۸۲
(۶) اقبال کا فکر وفن، افضل حق قریشی (مرتب)، یونی ورسل بکس لاہور، ۱۹۸۸ء، بار دوم، ص ۱۲۰
(۷) اکیسویں صدی اور پیغامِ اقبال از ڈاکٹر مس عصمت ناز مشمولہ قومی زبان، کراچی اپریل ۲۰۰۱ء، ص ۵۹
(۸) طیف اقبال، ممتاز منگلوری (مرتب)، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۱۵۲
(۹) اردو زبان، مسائل اور امکانات، سید شوکت علی شاہ (مرتب) مجلس تقریبات ملی پاکستان، لاہور ۱۹۹۲ء، ص ۲۱۸
(۱۰) علامہ اقبال ممتاز حسن کی نظر میں، ص ۱۳۶
(۱۱) ایضاً ص ۱۳۶
(۱۲) ایضاً ص ۶۶
(۱۳) اکیسویں صدی اور پیغام اقبال، قومی زبان کراچی، اپریل ۲۰۰۱ء، ص ۵۱

قہرِ عشق

ولیم شیکسپیئر کے شہرۂ آفاق ڈرامے

انطنی کلوبطرہ

کا منظوم ترجمہ

از

شان الحق حقی

صفحات: ۴۸۵ قیمت: ۱۲۰ روپے

اقبال اور جدیدیت

ناصر عباس نیر

ماڈرن ازم اقبال کی معاصر ادبی تحریک تھی۔ اس کا زمانہ ۱۹۱۰ء تا ۱۹۳۰ء قرار دیا جاتا ہے۔ مگر اس کے براہ راست اثرات اقبال کی شاعری پر نظر نہیں آتے۔ کیا اقبال اس تحریک سے آگاہ نہیں تھے یا ان کی انتخابی نظر اس تحریک کو اپنے شعری مقاصد سے ہم آہنگ محسوس نہیں کرتی تھی؟ غالباً دوسری بات درست ہے، اقبال مغرب کی ادبیات سے پورے طور پر آگاہ تھے۔ انھوں نے ''بانگِ درا'' میں درجن بھر امریکی اور برطانوی شعرا جیسے لانگ فیلو، ایمرسن، ولیم کوپر، ٹینی سن، براؤننگ، سیموئیل راجرز اور دوسروں کی نظموں سے اخذ و ترجمہ کیا ہے۔ ورڈز ورتھ کا انھوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور ۱۹۱۰ء میں اپنی انگریزی بیاض میں لکھا تھا کہ ورڈز ورتھ نے انھیں الحاد سے بچایا۔ اسی طرح ملٹن کا بھی ذوق وشوق سے مطالعہ کیا۔ اپنے ایک مکتوب مارچ ۱۹۱۱ء میں یہ بات درج کی کہ ''ملٹن کی تقلید میں کچھ لکھنے کا ارادہ مدت سے ہے اور اب وہ وقت قریب معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں وقت کا کوئی لحظہ خالی نہیں جاتا جس میں اس کی فکر نہ ہو۔'' شیکسپیئر کو انھوں نے منظوم خراج تحسین پیش کیا ہے۔ گوئٹے کے بھی اقبال پر مغربی جدیدیت کے اثرات تھے ان تمام شعرا کو ماڈرن کہہ سکتے ہیں کہ ان سب کا تعلق (زیادہ کا تعلق انیسویں صدی سے ہے) ماڈرنیٹی (ہمہ گیر جدیدیت) کے عہدے سے ہے... مگر ماڈرن اسٹ نہیں کہہ سکتے۔ ماڈرن اور ماڈرن اسٹ میں اتنا ہی فرق ہے جتنا ٹینی سن اور ایلیٹ میں یا تھیکرے اور جیمز جوائس میں ہے۔ دراصل اقبال نے مغربی ادبیات سے اخذ و استفادے کا عمل اپنے ابتدائی دور میں شروع کیا اور ۱۹۱۰ء تک ان کا شعری مائنڈ سیٹ، متشکل ہو چکا تھا۔ اپنے ابتدائی دور میں اقبال کا مغربی ادبیات سے تعلق تقلیدی ہے، انھوں نے کئی مغربی نظموں کو پورے کا پورا اور کہیں مغربی نظموں کے کچھ مصرعوں کو ترجمہ کیا ہے جیسے ''کوپر'' کے اس مصرعے And while the wings of fancy still are free کو نظم ''مرزا غالب'' کا یہ مصرع بنا دیا ہے:

ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا

مگر ۱۹۱۰ء کے بعد ان کی نظر انتخابی ہو جاتی ہے اور وہ اپنے شعری مائنڈ سیٹ کی راہنمائی میں معاصر مغربی ادبیات اور تحریکوں سے راست شاعرانہ ربط ضبط نہیں رکھتے۔ یوں بھی جن دنوں ماڈرن ازم کی تحریک زور وشور سے جاری تھی، اقبال مغربی تہذیب پر تنقید کا

آغاز کر چکے تھے اور ماڈرن ازم مغربی تہذیب ہی کا مظہر ہے۔ چناں چہ جن دنوں مغرب میں ''ویسٹ لینڈ'' اور ''یولی سس'' چھپتے ہیں انھی دنوں اقبال اردو میں نظم ''طلوع اسلام'' (۱۹۲۲ء) اور فارسی میں پیام مشرق (۱۹۲۳ء) تخلیق کرتے ہیں۔ ان کا فرق ظاہر ہے۔ اقبال، ایلیٹ اور جوائس کے نہ صرف موضوعات؛ ہیئتیں اور اسالیب مختلف تھے بلکہ جمالیاتی مقاصد بھی مختلف تھے۔

یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ ایک ہی عصر میں ادبی سطح پر انسانی سروکار مختلف ہو سکتے ہیں؟ یہ سوال اس وقت زیادہ اہم، متعلق اور بامعنی ہو جاتا ہے جب ہم ادب کے آفاقی ہونے کو ایک کلیشے کے طور پر لیتے ہیں، اصل یہ ہے کہ ہر ادبی تحریر، ادبی تحریک، ادبی نظریہ اور جمالیاتی نظام اور شعریات کسی نہ کسی تناظر اور صورت حال کی پابند ہوتی ہے۔ اس لیے کوئی تجربہ، تحریک، نظریہ یا شعریات آفاقی نہیں، وہ اپنی متعلقہ صورت حال اور تناظر میں ''آفاقی'' ہے۔ جہاں جہاں اور جب جب وہ صورت حال موجود ہوتی ہے اس کے تحت لکھا جانے والا ادب متعلق اور اسی مفہوم میں آفاقی ہوتا ہے۔ بنابریں بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے مغربی ادب پارے اور اقبال کی شاعری اپنی اپنی صورتِ حال اور تناظر کے پابند ہیں۔ ادب جب صورتِ حال اور تناظر سے الگ ہوتا ہے تو وہ ایلی نیشن (Alienation) کا شکار ہوتا ہے۔

ہر چند اقبال نے ماڈرن ازم سے راست ربط ضبط نہیں رکھا مگر ماڈرن ازم کے بعض تصورات اور اقبال کی شاعری کے بعض موضوعات میں تقابل و تماثل دلچسپی سے خالی نہیں۔ ماڈرن ازم کی تجربہ پسندی، روایت شکنی، تاریخی و جمالیاتی عدم تسلسل اقبال کے یہاں اپنے مغربی سیاق کے ساتھ موجود نہیں۔ انھوں نے نئی ہیئتوں کی تلاش کے بجائے روایتی ہیئتوں کو ہی اپنے لیے موزوں سمجھا ہے۔ اسی طرح روایت سے اپنی تعلق قائم رکھا ہے۔ جسے جدیدیت توڑنے میں افتخار اور لذت محسوس کرتی ہے۔ تاہم اسلوبی سطح پر اقبال نے تجربہ پسندی اور روایت شکنی کا مظاہرہ ایک خاص مفہوم میں بہر حال کیا ہے۔ اقبال نے اردو شاعری میں قطعی منفرد ڈکشن ہی متعارف نہیں کروایا بلکہ اسے بے مثال تخلیقی شان کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کچھ اس طور کہ یہ ناقابلِ تقلید ہے۔ اتنی شدید اور فقید المثال انفرادیت شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے یہاں موجود ہو جس کا مظاہرہ اقبال نے کیا ہے۔ ماڈرن ازم میں بھی انفرادیت پر زور ملتا ہے۔ کیا اقبال کی انفرادیت کا وہی مفہوم ہے جو مغربی جدیدیت میں ہے؟ بالکل نہیں اقبال کی انفرادیت اس کی اپنی انفرادیت ہے۔ تاہم یہ مشرقی شعریات میں قابل فہم ہے۔

مشرقی شعریات میں انفرادیت کے مظاہرے کو جدت کا نام دیا گیا ہے۔ جدت کے فن میں حسن ادا، اپج، معنی آفرینی، مضمون آفرینی، نکتہ سنجی، نازک خیالی ایسی اصطلاحات کا بھی ذکر ہوا ہے۔ جدت ان سب کو محیط ہے۔ سب جدت کی فروغ ہیں، اس طور جدت کا تعلق معنی اور اسلوب ہر دو سے ہے۔ جدت بہ قول ڈاکٹر عنوان چشتی: ''مانوس اشیا کے مخفی امکانات کی دریافت کا عمل ہے... جدت روایت کے بطن سے نمودار ہوتی ہے، مگر روایت پرستی سے انحراف آتی ہے۔'' گویا جدت انحراف ہے مگر جدیدیت کا انحراف نہیں، جدت کا انحراف بھی روایت کے حدود کے اندر ہوتا ہے۔ چناں چہ جس تخلیق کار کا روایت کا تصور وسیع گہرا، اور سرایت گیر ہوتا ہے اس کا انحراف اتنا ہی بڑا ہوتا ہے۔ اقبال کی انفرادیت دراصل جدت ہے۔ جدت کا مظاہرہ ہر چند اور بھی کئی اردو شعرا نے کیا ہے مگر روایت کا

جتنا وسیع اور گہرا تصور اقبالہ کا تھا اتنا کسی دوسرے اردو شاعر کا مشکل سے ہوگا۔ اقبال کی انفرادیت ناقابلِ تقلید تو ہے مگر اپنی مشرقی روایت میں قابلِ فہم بہرحال ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال نے مشرقی ادبیات کی روایت کو کھوجا ہی نہیں تھا اسے مرتب بھی کیا۔ اقبال نے فارسی، عربی، اردو، سنسکرت ادبیات کو ایک روایت ٹھہرایا اور اسے اپنی شاعری کی روح رواں بنایا۔ ان کے یہاں فارسی شعرا ملا عرشی، ابوطالب کلیم، فیضی، صائب، مرزا بیدل، عرفی، خاقانی، انوری، سنائی، حافظ، سعدی اور سب سے بڑھ کر فکر رومی کے اثرات بالواسطہ اور بطور تضمین ملتے ہیں۔ عربی ادبیات سے انھوں نے ہر چند کسی مخصوص شاعر کے اثرات نہیں لیے مگر عربی شعریات، کے اصول سادہ بیانی اور صحرائیت پسندی ضرور قبول کیے۔ مولانا غلام رسول مہر نے جب طلوعِ اسلام پر تنقید کی تو اقبال نے جواب دیا کہ ''میں عربی شاعری کی روش پر بالکل صاف صاف اور سیدھی سیدھی باتیں کہہ رہا ہوں۔'' اسی طرح انھوں نے متعدد قرآنی آیات کو راست یا ان کے ترجمے کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔ اقبال کا تصور روایت اگرچہ ایلیٹ کے تصور رایت سے مختلف ہے مگر دونوں میں یہ مماثلت موجود ہے کہ ایلیٹ نے تمام مغربی ادب کے حوالے سے ہومر سے بائرن تک کو ایک روایت قرار دیا۔ اقبال نے روایت کی تنقیدی تھیوری پیش نہیں کی مگر ادبی روایت کو مسلسل جاری روایت کی صورت اپنی شاعری میں مرتب؛ دریافت اور پیش کیا ہے۔ اقبال کی روایت مشرقی اسلامی روایت ہے۔ عبدالمغنی کا یہ کہنا درست ہے کہ ''اقبال کی شاعری درحقیقت مشرقی ادبیات کی تمام شاعرانہ روایت کا نقطۂ عروج ہے۔''

اقبال کا تصور روایت، مابعد جدید تنقیدی اصطلاح میں بین المتونی (Intertextual) ہے۔ فارسی، عربی، اردو اور سنسکرت ادبیات مختلف متون ہیں جنھیں اقبال نے باہم ممزوج کیا ہے۔ اقبال نے مختلف مشرقی روایات کو ایک نئے متن میں منقلب کر دیا ہے۔ یعنی یہ روایت اقبال کے شعری متن کے میکانکی اجزا نہیں نامیاتی عناصر ہیں۔ اقبال کا شعری متن ایک زندہ متن ہے اور ایک زندہ وجود کی طرح ہی نہ صرف حسی تحریک کا حامل ہے بلکہ مخصوص زاویۂ نظر اور آئیڈیالوجی بھی رکھتا ہے۔

ماڈرن ازم کے ''نظام فکر'' میں فرد کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ یہ اہمیت تین چار سطحوں پر فرد کو تفویض ہوئی ہے۔ فرد بطور منفرد و تنہا وجود، فرد کا زندگی کو مستند اور براہ راست طریقے سے تجربہ کرنا اور اس تجربے کے نتیجے میں اپنی تقدیر یعنی بے چارگی، تنہائی اور لغویت سے آگاہ ہونا، فرد کا سماج، فطرت اور کائنات سے داخلی انقطاع کی صورت حال سے دوچار ہونا یعنی جدید ادب کا فرد ایلی نیشن کا شکار ہے۔

ایلی نیشن کا تصور مارکسیت میں بھی ملتا ہے مگر جدیدیت اور مارکسیت کی ایلی نیشن ایک جیسی نہیں ہیں۔ مارکسی ایلی نیشن یہ ہے کہ فرد اپنی محنت کے وسائل اور ثمرات سے بوجوہ اجنبی ہو جاتا ہے۔ جب کہ جدید فرد کی ایلی نیشن ایک خاص فلسفیانہ تصور کی پیدا کردہ ہے... دل چسپ بات یہ ہے کہ اقبال کے یہاں بھی فرد موجود ہے۔ یہاں اشارہ اقبال کے مردِ مومن کی طرف نہیں۔ مردِ مومن ایک آدرش ہے جس میں وہ تمام بہترین خصوصیات یکجا ہو گئی ہیں جنھیں اسلامی تاریخ میں پیش کیا گیا ہے۔ مردِ مومن ایک ''غیر شخصی'' تصور ہے۔ یہ بشری تقاضوں سے بلند اور اعلیٰ انسانی مقاصد کا علم بردار ہے۔ اقبال کی شاعری میں بالخصوص بال جبریل کی غزلوں میں ایک اور فرد ظاہر ہوا ہے۔ یہ ایک شخصی وجود ہے۔ اس کا اپنا نقطۂ نظر اور اپنے سوالات ہیں۔ ہر چند اس کا لہجہ پُرتمکین اور کہیں جلالی ہے۔ مگر یہ

ایک حقیقی فرد ہے۔ اور اسی لیے تنہا بھی ہے۔ یہ چند اشعار اسی فرد کا اظہار ذات ہیں:

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدہ صفات میں
تو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو تیرا ہے یا میرا؟
اس کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

تو ہے محیطِ بے کراں میں ہوں ذرا سی آب جو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر
باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

یہ مشت خاک، یہ صرصر، یہ وسعتِ افلاک
کرم ہے یا کہ ستم تیری لذت ایجاد!

مذکورہ اشعار میں ایک ایسا فرد آشکار ہے جو تنہا مگر ایک اور ہستی کے روبرو بھی ہے اور روبرو ہونے سے ہی فرد اپنے وجود کی منفرد معنویت دریافت اور تلاش کرتا ہے حقیقتاً اس فرد اپنی بے معنویت کا سامنا نہیں بلکہ اپنی معنویت کے از سر نو تعین کے سوال کا سامنا ہے۔ چناں چہ یہ اس بے چارگی اور لغویت کا شکار نہیں جو جدیدیت کے فرد کو اس کی تقدیر کی صورت درپیش ہے۔ حالاں کہ اقبال کا فرد بھی زندگی کا مستند اور حقیقی تجربہ کر رہا ہے جسے جدیدیت کا فرد اپنے لیے لازم ٹھہراتا ہے۔ اقبال کے بعض ناقدین نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اقبال کی شاعری میں جدید فرد کہیں موجود نہیں۔ اقبال نے فرد کا پر عظمت تصور پیش کیا مگر جدید انسان جس ٹوٹ پھوٹ کا شکار، جس بے چارگی میں مبتلا اور جس تنہائی کے کرب سے دوچار ہے، اقبال نے اسے اپنی شاعری میں کہیں پیش نہیں کیا۔ ان ناقدین کے نزدیک اقبال نے حقیقی فرد کو نہیں فرد کے مثالی اور Glorified تصور کو پیش کیا ہے۔ ان نقادوں نے غالباً مردِ مومن کے تصور کو سامنے رکھا ہے اور اس فرد کی آواز نہیں سنی، جس کی زبانی چند اشعار اوپر درج کیے گئے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اقبال کا فرد اپنے وجود کے باطنی سرچشمے سے

منقطع نہیں ہوا، جب کہ جدید ادب کا فرد اپنے وجود کی معنویت کا یقین نئے سرے سے چاہتا ہے مگر معنویت کے گم ہو چکنے یا ''بے معنی'' ہونے کے بحران کا اسے سامنا نہیں ہے۔ نئے سرے سے معنویت کی طلب پر ماڈرنیٹی کی عقلیت پسندی کی پیدا کردہ تشکیک کا ہلکا سا سایہ موجود ہے مگر یہ طلب باطنی اور مابعدالطبیعیاتی سرچشمے پر سوالیہ نشان نہیں لگاتی۔ جدیدیت (ماڈرن ازم) میں یہ سوالیہ نشان جلی طور پر موجود ہے۔

لہٰذا جدیدیت اور اقبال کے فرد میں جو بنیادی فرق پیدا ہوا ہے وہ دونوں کے جداگانہ ''ورلڈ ویو'' کی وجہ سے ہے۔ جدیدیت کے فرد کا ''ورلڈ ویو'' روایت اور مابعدالطبیعیات کی نفی پر استوار ہے مگر اقبال کے فرد کا ''ورلڈ ویو'' ان دونوں کے اثبات پر مبنی ہے۔ ایک کی محرومی دوسرے کی قوت ہے۔

یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ کہ جدید فرد نے بیسویں صدی کے عظیم سانحات (عالمی جنگیں، اقتصادی بدحالی وغیرہ) کو جھیلا، اس لیے وہ بے بسی اور بے معنویت کے احساس میں مبتلا ہوا۔ کیا اقبال کے یہاں ان سانحات کی گونج موجود ہے؟ یہ الگ تفصیلی مطالعے کا متقاضی ہے۔ تاہم ایک بات واضح ہے کہ ایک مذہبی آدمی کسی المیے کا سامنا جس طور کرتا ہے، مذہب بیزار فرد اسی المیے کو کسی اور طریقے سے محسوس کرتا ہے۔

ماڈرن ازم کا تعلق اگر اقبال کی شاعری سے ہے تو ماڈرنیٹی اور ماڈرنائزیشن (تجدید کاری) کا تعلق اقبال کی فکر سے ہے۔ واضح رہے کہ اقبال کی فکر بیک وقت ان کی نثر اور شاعری میں ظاہری ہوئی ہے۔ سلیم احمد نے اقبال کی شاعری کا امتیاز ہی فکر کو قرار دیا ہے اور اس فکر کو اقبال کی انفرادی فکر بھی قرار دیا ہے۔ سلیم احمد نے جذبے، تصور اور جبلت سے تو فکر کو ممیز کیا ہے مگر فکر کی قسموں اور سطحوں میں فرق نہیں کیا اور نہ یہ بتایا کہ کہاں ان کی شاعری خاصل فکر کو اور کہاں شاعرانہ فکر کو پیش کرتی ہے۔ مثلاً اقبال کے یہاں متعدد اشعار ایسے موجود ہیں جو خالص فکر کو پیش کرتے ہیں فقط دو شعر دیکھیے:

عشق اب پیروی عقل خدا داد کرے
آبرو کوچۂ جاناں میں نہ برباد کرے
کہنہ پیکر میں نئی روح کو آباد کرے
یا کہن روح کو تقلید سے آزاد کرے

ان اشعار کو اقبال کے فکری موقف کا ترجمان سمجھا جاسکتا ہے۔ اور یہی خالص فکر کی نشانی ہے۔ جب کہ اس قسم کے اشعار ان کی شاعرانہ فکر کے علم بردار ہیں:

پریشاں ہو کہ میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب! پھر وہی مشکل نہ بن جائے

مذکورہ بالا اشعار جو اقبال کے فکری موقف کے ترجمان کے طور پر پیش کیے گئے ہیں، ماڈرنیٹی سے متعلق اقبال کے تصور کی نمائندگی کرتے

ہیں۔ ماڈرنیٹی کا اہم داعیہ عقلیت ہے اور اقبال نے بھی عشق کو عقل کی برتری تسلیم کرنے کی تجویز دی ہے۔ اس شعر کو اقبال کے عشق و عقل کے تصورات کے تناظر میں بھی اگرچہ دیکھا جا سکتا ہے مگر اقبال نے ان اشعار کو ''ادبیات'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے اور ''ضربِ کلیم'' میں انھیں درج کیا ہے جو عہد جدید کے خلاف اقبال کے اعلانِ جنگ یعنی اقبال کے فکریت موقف کی علم بردار ہے۔ عقل کی اہمیت کا دوسرا مطلب عقلی وسائل کی مدد سے مذہبی و معاشرتی تجدید ہے۔ اس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ اقبال تجدید یا ماڈرنائزیشن یا تجدید کاری کا تصور کیا تھا؟ اس تصور کا سرچشمہ Origin کیا تھا اور اس کے مضمرات و امکانات کیا تھے؟

یہاں اقبال کے تجدید کاری کے تصور کی جملہ پیچیدگیوں میں جانا ممکن نہیں، اس تصور کے مرکزی نکتے کو بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ خود اقبال کی زبانی سنیے: خطبات (مذہبی فکر کی تشکیل نو) میں لکھا ہے:

> The only course open to us is to approach Modern knowledge with a respectful but independent attitude and to appreciate the teaching of Islam in the light of that knowledge even though we may be led to differ from those who have gone before us.

یعنی جدید مسلمانوں کے لیے واحد راستہ یہ ہے کہ وہ جدید علم سیکھیں اور اس کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی تحسین کریں۔ تحسین کا لفظ اقبال نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ انھیں یقین ہے کہ اسلام ماڈرن علوم کی تحقیقات کی نفی نہیں تائید و توثیق کرتا ہے گویا اسلام جامد نہیں متحرک نظام حیات ہے۔ چناں چہ اقبال نے ماڈرنیٹی کا مفہوم و مدعا یہ لیا کہ نہ صرف جدید عقلی و سائنسی علوم کو پڑھا جائے بلکہ مذہبی صداقتوں سے ان کی تطبیق بھی کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں اقبال کی ماڈرنیٹی عقل و عقیدے، سائنس و مذہب کی تطبیق پر مبنی ہے۔ ماڈرنیٹی کے اسی ایجنڈے کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال نے واضح اور ثابت کیا کہ توسیعِ کائنات اور ارتقائے حیات کے تصورات اس قرآنی آیت میں (اشارتاً) موجود ہیں:

> تم کہہ دو کہ تم زمین میں چلو پھرو، پھر غور سے دیکھو کہ اللہ نے خلق کو شروع کیوں کر کیا۔ پھر وہی اللہ
> ان کی آخری اٹھان بھی اٹھالے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔ (۲:۲۹)

اسی طرح اقبال کے خیال میں آغازِ حیات کے نئے نظریات ابن مسکویہ اور رومی کے یہاں موجود ہیں مثلاً رومی کے یہ اشعار:

آمدہ اوّل با قلیم جماد
در نباتی از جمادی او فتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد
وز جماتی یاد ناورد از بزد
نایدش حال نباتی، ہیچ یاد
باز از حیواں سوے انسانیش
می کشدگاں خالقے کہ دانیش

مزید برآں اقبال نے ایٹمی نظریے کا سراغ اشاعرہ کے یہاں لگایا ہے۔ اشاعرہ نے ہی، اقبال کے خیال میں، سب سے پہلے وقت کے مسئلے پر غور کیا اور کہا کہ وقت مفرد ''اب'' کا تسلسل ہے۔ اقبال کا قصۂ قدیم و جدید کو دلیل کم نظری قرار دینا اشاعرہ کے اسی تصور وقت سے ماخوذ ہے۔ اقبال نے فخر الدین رازی، ملا جلال الدین دوانی، عراقی اور ملا باقر کے جدید نظریات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اقبال کی ان کوششوں کا مقصد یہ باور کرانا ہے کہ ماڈرنیٹی اور اسلام میں کوئی مغائرت نہیں۔ ماڈرنیٹی اپنی جن علمی و سائنسی تحقیقات پر تفاخر کرتی ہے وہ اسلام اور اسلامی تاریخ کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ استقرائی طرز فکر جدید مغربی تہذیب کی بنیاد ہے اور اقبال اس فکر کو اسلام کا اختصاص قرار دیتے ہیں اور اسی لیے وہ مغربی تہذیب کو ایک مخصوص تناظر میں اسلامی تہذیب کی توسیع بھی کہہ سکتے ہیں۔ اقبال کے اس دعویٰ کی علمی و تاریخی بنیاد کا سوال ایک طرف، اس دعویٰ نے یہ تاثر ضرور مٹا دیا کہ جدیدیت کا دوسرا نام ''مغربیانا'' (ویسٹرنائزیشن) ہے۔ اقبال کی یہ عطا کچھ کم نہیں کہ انھوں نے جدیدیت کو مغربیت سے آزاد کیا جو سرسید سے نہیں ہو سکا تھا۔

اقبال کے تصورِ جدید کا سرچشمہ ایک طرف سرسید کا اصول تطبیق ہے (سرسید نے کہا تھا کہ ہمارے پاس اب ایک ہی راستہ ہے کہ یا تو حکمتِ جدید کا بطلان کر دیا جائے یا اس سے ہم آہنگ ہوا جائے۔ سرسید نے ہم آہنگ ہونے کو ترجیح دی) اور دوسری طرف اقبال کے عہد کا سماجی اور علمیاتی تناظر ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد کا یہ کہنا وزن رکھتا ہے کہ اقبال کی فکر کو ان کے عہد کے تناظر میں دیکھا جائے کہ اقبال نے ماڈرنیٹی کے ضمن میں جو موقف اختیار کیا وہ اسی تناظر میں انھیں سوجھا اور اسی تناظر میں وہ موزوں اور vaild بھی ہے۔ حقیقتاً ماڈرنیٹی اور ماڈرنائزیشن تمام غیر مغربی اقوام اور بالخصوص اسلامی ممالک کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کا مستقل اور ہر سطح پر قابل قبول حل اب تک پیش نہیں ہو سکا اور مختلف ممالک میں جو حل تجویز کیے گئے ہیں وہ ان ممالک کے سماجی تاریخی تناظر کے زائیدہ ہیں نیز ایک ہی ملک میں مختلف اوقات میں مختلف حل سامنے آئے ہیں۔ مثلاً ترکی اور مصر میں ابتدائیں ماڈرنائزیشن سے مراد مغرب کی عسکری ٹیکنیک کا حصول تھا اور ہندوستان میں ابتداً ماڈرنائزیشن کا مطلب جدید مغربی انگریزی تعلیم سے بہرہ مند ہونا تھا۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ محکوم ممالک میں ماڈرنائزیشن بڑی حد تک ویسٹرنائزیشن کے مترادف سمجھی گئی ہے۔ اس لیے کہ مغرب نے غیر مغربی اقوام کو اپنی تہذیب کے جس پہلو سے زیادہ متاثر یا مغلوب کیا وہی پہلو محکوموں کا آدرش بنا۔ غالباً اسی لیے اقبال نے کہا تھا:

بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط سردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

چناں چہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ غلام اقوام نے ماڈرنیٹی کا بالعموم سطحی تصور قائم کیا ہے۔ انھوں نے ماڈرنیٹی کو اس کے ہمہ گیر تناظر میں نہیں دیکھا، اس پراسس کو سمجھنے کی سعی نہیں کی، جس نے ماڈرنیٹی کو ممکن بنایا۔ ٹیکنالوجی یا علوم تو ماڈرنیٹی کے آئس برگ کا وہ معمولی سا حصہ ہیں جو سمندر پانی سے باہر ہوتا ہے۔ ماڈرنیٹی کے پورے پراسس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی بیشتر مسلم ممالک میں ماڈرنیٹی ممکن نہیں ہوئی۔ اقبال کو اس امر کا شدت سے احساس تھا انھوں نے سید سلیمان ندوی کے نام خط میں لکھا کہ ''مسلمان ذہنی انقلاب کے اسی مرحلے میں داخل ہونے والے ہیں جس سے یورپ لوتھر کے زمانے میں گزرا تھا'' (مگر کیا واقع؟) اقبال اس نوع کا ذہنی انقلاب لانے

کی غرض سے ہی اسلامی فقہ کی تدوین نو کرنا چاہتے تھے، صوفی تبسم اور غلام السیدین کے نام مکاتیب میں اقبال نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے۔

اب ایک نظر اقبال کے ''تصور جدیدیت'' کے حدود اور امکانات پر!

اقبال عقلیت اور جمہوریت کے مخصوص تصور کے قائل تھے۔ آمریت شہنشاہیت اور ملائیت کے خلاف تھے اس ضمن میں ان کے یہاں درجنوں فارسی اور اردو اشعار موجود ہیں۔ اسی طرح ذہنی جمود کے نکتہ چیں اور متحرک نظام فکر میں یقین رکھتے تھے مگر مظہر الدین صدیقی کے بہ قول اقبال نے ماڈرنائزیشن کے مسئلے کا تجریدی اور فلسفیانہ حل تو بخوبی دریافت کیا، مگر:

> He does not seem to have realised the importance of the socio-economic structure in moulding mess's mind, live and personality.

ہر چند اقبال کی شاعری میں معاشی سماجی عوامل کا ذکر لکھا ہے تاہم ایک تھیوری کے طور پر اقبال نے اسے پیش بہر حال نہیں کیا۔ اس لیے کہ اقبال کا مطمح نظر مذہب و سائنس کی تطبیق تھا۔ اصولی طور پر جب دو چیزوں کو اکٹھا کیا جاتا ہے تو ایک لازماً برتر اور دوسرے کو ثانوی اور اس پر منحصر قرار دیا جاتا ہے۔ اقبال نے مذہب، سائنس یا عقل و وجدان کے ضمن میں جو درجہ بندی کی، اس میں اولیت مذہب اور وجدان کو دی اور عقل اور سائنس کو مذہب کی تعبیر نو کا وسیلہ بنایا۔ دوسرے لفظوں میں عقل اور سائنس کو ان کی آزاد حیثیت میں قبول کرنے کی بجائے انھیں مذہبی صداقتوں کے تابع رکھا۔ انھیں مقصد نہیں وسیلہ قرار دیا۔ جس کا صاف مطلب ہے کہ انھوں نے آزادانہ سائنسی تحقیقات کے حق میں آواز بلند کرنے کے برعکس ''ہو چکی سائنسی تحقیقات'' سے (ایک خاص مقصد کے تحت) استفادے پر زور دیا۔ ہر چند بعض مقامات پر اقبال نے عقل کی برتری کا دعویٰ کیا ہے مگر بالعموم عشق کے مخصوص و محدود تصور کے مقابلے میں ایسا کیا ہے۔ سائنس کی برتری کو تسلیم کرنا شاید اقبال کے لیے ممکن نہ تھا کہ سائنس نے جس ماڈرنیٹی سے جنم لیا ہے، وہ اپنی اصل میں ''بشر مرکزیت'' ہے۔ اقبال عالم گردوں کو بشریت کی زد میں ٹھہرانے کے باوجود بشر کو مرکز فلسفے کو قبول نہیں کر سکتے تھے کہ اسے قبول کرنے کا مطلب ماڈرنیٹی کو پورے کا پورا قبول کرنا تھا۔ صاف لفظوں میں یہ کہ علم کا سرچشمہ وحی کے بجائے انسانی عقل تسلیم کرنا تھا۔ اقبال ماڈرنیٹی کو تنقیدی اور انتخابی طور سے قبول کرنے کے حق میں تھے۔ اقبال ماڈرنیٹی کے نکتہ چیں بھی تھے اور مداح بھی۔ اقبال دراصل اپنی اسلامی ثقافتی نہاد کو قائم و برقرار رکھتے ہوئے مغربی جدیدیت سے اخذ و استفادے کے قائل نظر آتے ہیں۔ ایک خاص مفہوم میں یہ ایک جدید اور ترقی پسندانہ نقطہ نظر تھا۔

فیضانِ اقبال کی ایک روشن مثال

ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان

علامہ اقبال نے اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط میں تحریر کیا تھا:

''کسی شاعر کو داد دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اگر داد دینے والا شاعر ہو تو جس کو داد دینا مقصود ہو تو اس کے رنگ میں شعر لکھے یا با الفاظِ دیگر اس کا تتبع کر کے اس کی فوقیت کا اعتراف کرے۔''

عصرِ حاضر کے ممتاز شاعر اسلم انصاری کا شعری مجموعہ ''فیضانِ اقبال'' بھی ایک ایسی ہی تصنیف ہے جس میں اقبال کی شاعرانہ عظمت کا والہانہ اعتراف کیا گیا ہے۔ اسلم انصاری نے اقبال کے رنگِ سخن کی تقلید کی ہے لیکن یہ تقلید دراصل ایک نئی طرز کی تشکیل ہے۔ ان کا یہ مجموعہ فکرِ اقبال کی نئی شعری تشکیلات پر مبنی ہے۔ فکرِ اقبال کی یہ شاعرانہ ترجمانی جہاں تحسین اور ستائش کا حق ادا کرتی ہے وہاں تفہیم اور تشریح کے علمی تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہے۔ اسلم انصاری نے اقبال کے بنیادی تصورات کو تخلیقی سطح پر قبول کرتے ہوئے ایک ایسا آئینہ خانہ تعمیر کیا ہے جس میں نت نئے عکس ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ یہ مجموعہ محض اقبال کی فوقیت کا اعتراف نہیں بلکہ اقبال سے الفت کا اعلان بھی ہے اور شاعر کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار بھی! اور اسی سبب سے ''منظوم اقبالیات'' میں یہ مستقل قدر و قیمت کا حامل ہے۔

اس شعری تصنیف کی اولین نظم ''بیادِ مجلس اقبال'' ہے جسے گو شاعر نے ''منظوم ریڈیائی تشکیل'' بتلایا ہے، تاہم ذرا سی کوشش سے یہ تشکیل ''تمثیل'' کے طور پر تھیٹر یا ٹیلی ویژن پر پیش کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر ذرائع ابلاغ اور نشریاتی سہولتیں میسر نہ ہوں تو قاری ادب کے صفحات پر اس نظم کا مطالعہ کر کے اپنے ذوق کی تسکین کا سامان کر سکتا ہے۔ یہ ایک مکمل اور موثر ادب پارہ ہے۔

یہ نظم نقادانِ اقبال کے منتخب افکار و خیالات پر مبنی منظوم تشکیل ہے۔ یہ ایک کرداری نظم ہے۔ جس کے مرکزی کردار اقبال کے پانچ اہم ناقدین ہیں جب کہ ''راوی'' اور ''نوائے سروش'' جزوی کردار ہیں۔ ناقدین میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر یوسف حسین خان، پروفیسر آرتھر آربری، ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، الیزاندر بوسانی اور ڈاکٹر این میری شمل شامل ہیں۔ نظم کے آغاز میں دو راویوں کے مابین ایک مکالمہ ہوتا ہے جو اقبال کے اس شعر کا مفہوم لیے ہوئے ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اسلم انصاری نے دلکش مکالماتی پیرائے میں اس شعر کی تشریح اور توسیع کی ہے۔ یہ مکالمہ آزاد نظم کی صورت میں ہوا ہے۔ منتخب بند ملاحظہ ہوں:

راوی ۱: مدت العمر، کسی شعلۂ معنی کے لیے
مضطرب رہتے ہیں سب۔
لفظ و بیاں، حرف و سخن، شعر کا فن، حسنِ ادب!
عہد تا عہد کوئی جام، نہ جرعہ سرِ مے خانہ جاں
دَور تا دَور، کوئی شمع، نہ شعلہ، نہ الاؤ نہ شرار
قرن تا قرن، فقط ایک صدا، ایک نوا، ایک پکار

راوی ۲: ہے کوئی منزلِ آدم کا سراغ؟
ہے کہیں عظمتِ انساں کا نشاں؟
ہے کہیں مے کدۂ جاں میں کوئی سوزِ تمنا کا ایاغ!

(صوتی اثرات)

راوی ۱: کتنی صدیاں یہی الجھن کہ گرہ دل کی کھلے گی کیسے!
کتنی مدت یہی دبدا کہ گھٹا غم کی چھٹے گی کیسے!

راوی ۲: جب کئی قرن، کئی عہد کئی دور گزر جاتے ہیں

راوی ۱: تب کہیں جا کے ملے فطرتِ ہستی سے اشارہ کوئی
تب کہیں جا کے ابھرتا ہے ستارہ ہے کوئی!

راوی ۲: وہ ستارہ جو کہیں حافظ شیراز کہیں رومی ہے
کہیں سعدی، کہیں ہومر، کہیں گوئٹے، کہیں غالب کا سخن
اور کہیں شاعرِ مشرق کے خیالات کا رنگین و دلاویز چمن!

مکالمے کے اختتام پر نوائے سروش سنائی دیتی ہے جو دراصل ''نوائے ستائش'' ہے۔ اس آواز کے مطابق اقبالِ رازِ خودی کا استعارہ اور فطرت کے شعور کا ستارہ ہیں۔ وہ زندگی اور ذات کی آگہی کے شاعر ہیں۔ وہ خوابِ مشرق کی ایک تعبیرِ جمیل ہیں۔ وہ عصرِ نور کے رازدان ہیں اور اپنی ذات میں ایک کاروان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بعدازاں اناؤنسر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کو دعوتِ خطاب دیتی ہے۔ خلیفہ صاحب منظوم انداز میں سخن آرا ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں اقبال ارضِ پاکستان کے مصور ہیں۔ ان کے شعر میں جانگدازیٔ تسلیم اور ان کے آہنگ میں نوائے کلیم ہے۔ وہ خودی اور بے خودی کے امام اور خبر ونظر کے آئینہ دار ہیں۔ اقبال کی شاعری فلسفہ اور دین فکر سے عبارت ہے اور خودشناسی کی مظہر ہے۔ خلیفہ صاحب کی زبان سے اقبال کی شاعری کے بارے میں یہ خوبصورت شعر ادا ہوتا ہے:

اس کا پیغام ایسا عام ہوا
شعر و اقبال ایک نام ہوا

خلیفہ صاحب کی فکر انگیز شاعرانہ گفتگو کے اختتام پر اناؤنسر آرتھر آربری کے بارے میں رطب اللسان ہوتی ہے۔ یہاں اسلم انصاری نے آرتھر آربری کے نام کی رعایت سے اندرونی قوافی کا ماہرانہ اہتمام کیا ہے:

ترجمانی میں جو کرتا ہے ہر اک بات کھری، آرتھر آربری
فکرِ اقبال کی کھیتی ہوئی اس شخص کی ہمت سے ہری، آرتھر آربری

آرتھر آربری کے بقول ''جاوید نامہ'' اقبال کے فکر وسخن کا ایک شاہکار ہے۔ ڈانٹے کی طرز میں لکھی ہوئی یہ رزمیہ نظم شاعر کے فکرِ سیاسی کی تفسیر ہے۔ معنوی طور پر اس بڑی نظم میں ابنِ آدم کو گویا خدا کے رفیق اور ساتھی کی صورت میں دکھایا گیا ہے اور یہ خیالات نیطشے کی فکر سے کچھ مماثلت رکھتے ہیں۔

آرتھر آربری کے بعد عبدالوہاب عزام کو دعوتِ کلام دی گئی جنھیں اسلم انصاری نے اناؤنسر کی زبانی ارضِ مصر کا جوہر قرار دیا۔ عزام ہی کی بدولت عرب دنیا میں یہ راز عیاں ہوا کہ پاک و ہند کا ایک شاعرِ بلند آواز، ملتِ اسلامیہ کے چارہ ساز کے طور پر سامنے آیا ہے۔ عبدالوہاب عزام کے مطابق انسانی تاریخ میں ایسے نادر انسان کم ہی ہوئے ہیں جن کی طبیعت خلاق ہو اور وہ فکرِ مجسم اور سوزِ سراپا ہوں۔ عصر رواں کی چکاچوند روشنیوں میں آج مسلمان حیرت کے دوراہے پر کھڑا ہے۔ ایک طرف مستقبل ہے اور دوسری جانب موروثی دنیا۔ ایسے عالم میں اقبال نمودار ہوتے ہیں۔ جنھوں نے تہذیبِ جدید کے عیب وصواب اور حسن وقبح کو خوب پرکھا ہے اور مسلمانوں کی نئی منزلوں کی جانب راہنمائی کی ہے۔

اطالیہ کے مفکر، ادیب اور دانشور الیزاندر بوسانی کو منظوم اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تو وہ گویا ہوئے کہ اقبال کے ہاں فوق البشر کی قہرمانی ہی نہیں بلکہ مردِ مومن کی تبسم آفرینی بھی ہے۔ بوسانی کے نزدیک اقبال کا یہ خیال کہ آدمی خلاق ہے، بہت کشش انگیز ہے۔ بوسانی پیرایۂ شعر میں بیان کرتے ہیں کہ اقبال کا فلسفہ یہی ہے کہ وہ امانت جس کے باعث آدم، نائب یزداں ہے، دراصل ''انا'' (Ego) ہے جس کی اصل زماں ہے۔ ''انا'' اگرچہ اپنے تفرد کے سبب محدود ہے لیکن اس کے زینۂ پیچاں سے ہم انائے مطلقہ کے حضور جا پہنچتے ہیں۔

ڈاکٹر یوسف حسین منظوم خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں کہ اقبال کے ہاں حکایت اور حکمت ہے، دین کی تعلیم اور عشق کی تلقین ہے،

ایک نئے فلسفۂ زیست کا آوین ہے، فکر و وجدان کے مہر و مہ و انجم کی ضیاپاشی ہے، شوقِ پرواز اور جوشِ تگ و تاز ہے۔ اقبال کا فن حسن اور عشق کے اسرار کا حامل ہے۔

اس ''منظوم مباحثے'' کی آخری ''مقرر'' این میری شمل نے اقبال کو ''ضمیرِ برصغیر'' قرار دیا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ اقبال دینی علوم کے برعکس ذوق و وجد سے وصال کی تدبیر کرتے تو بہتر تھا۔ اسلم انصاری کی یہ نظم شعری خوبیوں سے مزین ہے البتہ اسلوب کہیں کہیں براہِ راست ہو گیا ہے جس سے شعریت متاثر ہوئی ہے۔ اس کی توجیہ انصاری صاحب نے دیباچے میں یہ بیان کی ہے:

''اس تالیف کے بیشتر اجزا ''کلامِ منظوم'' کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کے بارے میں شعریت کا ادعا خود فریبی کے مترادف ہوگا۔ شاعری اور ''کلامِ منظوم'' کا فرق مسلمات میں سے ہے، لیکن دنیا کی اکثر اچھی، معیاری اور بڑی شاعری بھی جس کے ساتھ مشابہت پیدا کرنا ہر شاعر کی خواہش بھی ہوتی ہو اور کوشش بھی، کلامِ منظوم ہی کی صورت میں پائی جاتی ہے۔''

''فیضانِ اقبال'' کی دوسری نظم ''اقبال — عالمِ مثال میں'' ہے جو دراصل بعض مفکرینِ عالم اور اقبال کے مابین ایک منظوم مکالمہ ہے۔ اس نظم کی وضاحت شاعر نے ان الفاظ میں کی ہے:

''اقبال — عالم مثال میں'' اسی اسلوب میں لکھا ہوا ایک تصوریہ یا فنطاسیہ (Fantasia) ہے جس میں تخیل کی سطح پر دنیائے ادب اور فلسفہ کے کچھ ایسے نامور نمائندوں کو اپنی بات کہنے کی اجازت دی گئی ہے، جو مثنوی اسرارِ خودی میں بالخصوص اقبال کی کڑی تنقیدی کا نشانہ بنے ہیں، ان میں یونان کے افلاطون الٰہی اور فارسی کے عظیم غزل گو خواجہ حافظ شیرازی ممتاز اور نمایاں ہیں، موخرالذکر کو مسلمانوں کے ادب میں صدیوں سے ''لسان الغیب'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس خیالی مکالمے (Colloquiam) میں اقبال کے ان معتوبین کے علاوہ بعض دوسرے مفکرین مثلاً نیطشے اور برگساں نے بھی اقبال سے کچھ گلے شکوے کیے ہیں۔ جن میں موجود ایک انسانی عنصر (Human Element) ان کو حقیقت کا شائبہ عطا کرتا ہے اور اس عالمی مکالمے میں توازن اور انصاف کا عنصر بھی پیدا کرتا ہے جو اقبال کی ہمہ گیری فکر کے ذریعے ہماری شاعری کے پیش منظر کا حصہ بن گیا ہے۔ لیکن اقبال نے جس طرح ان کے شکووں کا جواب دیا ہے اس سے ایک بار پھر اقبال کے نقطۂ نظر کی تصویب ہوتی ہے۔''

اسلم انصاری نے اس نظم میں اقبال کی معروف طویل نظموں — ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' کی تکنیک کو بروئے کار لاتے ہیں مگر یہاں وہ شوخی اور بے باکی نہیں جو اقبال کی ان لافانی نظموں کا طرۂ امتیاز ہے۔ دراصل ان عناصر کی مذکورہ نظم میں یوں ضرورت نہ تھی کہ یہاں مکالمہ کرنے والا وہ انسان نہیں ہے جس کے بارے میں کہا گیا: بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو! یہاں مکالمہ کرنے والے ''دانایانِ عالم'' ہیں اور اسی لیے ان کے مکالمات عالمانہ وقار اور مفکرانہ شان کے حامل ہیں۔ ان مفکرین نے اقبال سے احترام آمیز پیرائے میں شکوے اور شکایتیں کی ہیں اور جواب میں بھی آداب و اخلاق کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس انداز سے ایک خاص طرح کی انفرادیت پیدا ہوئی ہے جو اسلم انصاری کی نظم کو جداگانہ شناخت عطا کرتی ہے۔

نظم کا فرضی اور تصوراتی انداز ''جاوید نامہ'' کی یاد دلاتا ہے۔ یہاں محض نظم کے داخلی ماحول اور ''تمثیلی مفاہمت'' ہی سے قاری کو

یہ احساس ہو پاتا ہے کہ یہ مکالمہ زمان و مکاں سے بے نیاز عالم میں ہو رہا ہے۔ نظم میں دکھایا گیا ہے کہ افلاطون، اقبال سے یہ شکوہ کرتے ہیں کہ وہ ان کے تصورِ اعیان کو درست طور پر نہیں سمجھ پائے اور نہیں ''گوسفند'' قرار دے دیا۔ نیطشے کو یہ شکایت ہے کہ مردِ کامل ان کے فوق البشر کے تصور ہی کی ایک صورت ہے۔ انھیں ''مجذوب فرنگی'' کو مقامِ کبریا'' سمجھانے والی بات کا بھی گلہ ہے۔ برگساں اور اقبال کے مابین جو مکالمہ ہے، اس کی وضاحت انصاری صاحب نے حاشیے میں یوں کی ہے:

''عام مغربی فلسفیوں میں اقبال فکری طور پر سب سے زیادہ برگساں ہی کے قریب دکھائی دیتے ہیں۔ مندرجہ بالا مکالمہ صرف اس امکان کے سدباب کے لیے لکھا گیا ہے کہ آنے والے دنوں میں اقبال کے تصورِ زمان کو ان کے تصورِ الٰہ کا بدل نہ سمجھ لیا جائے۔''

اس نظم کے اسلوب اور مزاج کو جاننے کے لیے نمونے کے طور پر حافظ شیراز کا ''شکوہ'' درج کیا جا رہا ہے:

سنا ہے مجھ کو بھی کچھ سخت ست فرمایا
اگرچہ بعد میں ''القط'' بھی اس کو ٹھہرایا
مگر عزیزِ گرامی! یہ کیا خیال آیا
کہ مجھ فقیر پہ اس طرح طعن فرمایا!
غلط نہیں جو کہوں میں کہ میرا عودِ غزل
ہوا ہے آپ کے ہاں شاملِ سرودِ غزل
سروشِ غیب کا گہ گاہ ہم زباں ہونا
کوئی گناہ نہیں میرا خوش بیاں ہونا
یہ سُکر و صحو کے مبحث میں اس قدر شدت
مجھے تو ہوتی ہے اس بات پر بہت حیرت!
جو عشق آپ کا ہے میرا عشق بھی ہے وہی
دعائے نیم شبی و سحر گہی ہے وہی
یہ اختلافِ طبائع ہے زیست کا حاصل
میں سوز ہی کا نہیں ساز کا بھی ہوں قائل
یہ نکتہ گرچہ ہے بے حد دقیق اور باریک
وصال، جرم نہیں خاکسار کے نزدیک
مجھے خوشی ہے کہ میرا نظامِ صورت و صدا
کہیں تو آپ کے آہنگ سے بھی ہے پیدا

میں شاد ہوں کہ بہت آپ خوش نصیب رہے
سروشِ غیب کے، میری طرح قریب رہے!

یہ ایک دلکش مکالماتی نظم ہے جس کا خطابیہ لہجہ خاص طور پر قابلِ ستائش ہے۔ لہجے اور تکلم کے دیگر انداز بھی قابل توجہ ہیں۔ ''منظومِ اقبالیات'' میں یہ ایک زندہ رہنے والی نظم ہے۔

''جہانِ اقبال'' کے عنوان سے مجموعے میں شامل نظم میں اقبال کے بعض معروف اور بنیادی تصورات کی تشکیل نو کی گئی ہے۔ اس نظم میں ذیلی عنوانات کے تحت خودی، مردِ کامل، شاہین، اقوامِ مغرب، اقوامِ مشرق، تعلیم، افراد، بادشاہی مسجد اور تہذیبِ نو کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس منظوم کاوش کے حوالے سے اسلم انصاری نے دیباچے میں تحریر کیا ہے:

''اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تخلیقی سطح پر اقبال کے بعض تصورات کی تشکیلِ نو نہ صرف ممکن ہے بلکہ ضروری بھی ہے، اس طرح شاید اردو شاعری اقبال کے مقامِ نظر سے آگے بڑھنے کی سعی کر سکے، یہ سعی شاید خود اقبال کی نظر میں بھی محمود ہوتی اس لیے کہ اردو شاعری میں تغیر اور ارتقا کا علمبردار اقبال سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوا۔''

انصاری صاحب کی یہ نظم اپنی بلند خیالی، جدت طرازی اور وسعت پذیری کے باعث قابلِ توجہ ہے۔

اردو شاعری میں اقبال کے ''ساقی نامہ'' کو فکری اور فنی اعتبار سے جو اہمیت حاصل ہے، اہلِ نظر اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ بعدازاں اقبال کے تتبع میں کئی اہم اور غیر اہم شاعروں نے ساقی نامے تحریر کیے۔ اسلم انصاری نے اسی روایت کے زیر اثر ''ساقی نامہ (جدید)'' رقم کیا ہے۔ اس میں بعض تاریخی اور عصری فلسفیانہ تصورات اور مباحث کو پیش کیا گیا ہے۔ انصاری صاحب کے بقول:

''ان مباحث میں خود علامہ اقبال کا تصورِ ''خودی'' سرفہرست ہے، لیکن اسے تاریخ کے جدلیاتی عمل اور عصر حاضر کی معروف فکری روش فلسفۂ وجودیت کے تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی سعی کی گئی ہے، اور ایک امتزاجی نقطۂ نظر سے تاریخ و حیات کے تناقضات سے ذہنی سطح پر عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی گئی ہے۔''

اسلم انصاری کا یہ ''ساقی نامہ'' منفرد اندازِ فکر اور جدید طرزِ احساس کا حامل ہے اور بعض شعری و فکری امکانات کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

''فیضانِ اقبال'' کے آخری حصے کا عنوان ''گل منظر سے قریں'' ہے۔ اس حصے میں تین کینٹوز شامل ہیں جو انصاری صاحب کی فنی پختگی کی دلیل ہے۔ پہلے کینٹوز کا عنوان ''مراجعت'' ہے جو بادِ شمال کا ایک خیالی رپورتاژ'' ہے۔ دوسرے کینٹو کا عنوان ''اگر غم کارگر ہوتا'' اور تیسرے کا ''اگر پیغام دینا ہو'' ہے۔ ان کینٹوز میں فکری گہرائی بھی اور شاعرانہ دلکشی بھی! — ''فیضانِ اقبال'' کے مصنف کو اقبال کے افکار و خیالات سے غیر معمولی شغف ہے۔ وہ ان کی شاعرانہ عظمت کے قائل ہیں اور ان کے اسلوب کے مداح۔ فلسفہ ان کا خاص میدان ہے اور فنونِ لطیفہ ان کے لیے ذوق کی تسکین کا سامان، وہ ایک بالغ نظر نقاد ہیں اور ایک نغز گو شاعر! یوں وہ تمام اوصاف جو شاعر کی ذات میں موجود ہیں، اس مجموعے میں بھی یکجا ہو گئے ہیں۔

اقبال کی مذہبی اور صوفیانہ تلمیحات

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین

کلامِ اقبال میں اسلام، یہودیت، عیسائیت، بدھ ازم اور ہندوازم کے علاوہ سکھوں، پارسیوں اور بابیوں کے مذاہب و مسالک سے منسلک مختلف اشخاص و واقعات اور تصورات کو توسیع و ترسیلِ مطلب کے لیے غیر معمولی بے ساختگی اور رچاؤ سے تلمیح کیا گیا ہے۔ اسی طرح تصوف کے بنیادی نظریات، اصطلاحات اور نمایندہ صوفیا پر مبنی تلمیحات جابجا نمود کرتی ہیں۔ یہ مذہبی و صوفیانہ تلمیحاتی سرمایہ بڑا جاندار، دوٹوک اور براہِ راست ہے اور صوفیانہ تلمیحات میں تو وہ ایک بہت بڑے طنز نگار کے طور پر ابھرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اسلامی تلمیحات کے ساتھ دیگر مذاہب کی تلمیحوں کو آمیخت کر کے حیران کن نتائج کا استخراج کرتے ہیں اور ایسی ملی جلی تلمیحات میں ان کا اسلوب خاصا مدلّل بھی ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے ادیان اور مسلکوں کا تذکرہ شعرِ اقبال میں آتا بھی اس لیے ہے کہ وہ اسلام کی حقانیت اور اکملیت کو تقابل و آویزش سے عیاں کرنا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر اقبال کی صوفیانہ تلمیحات اس لیے بھی لائقِ استحسان ہیں کہ ان کی وساطت سے علامہ نے ایک ایسے دور میں تصوف کے متداول و مرغوب نظریے ''وحدۃ الوجود'' کا ایراد کیا جب کہ اس کے خلاف لکھنا اور ایک بہت بڑی بدعت شمار کیا جاتا تھا۔ اندریں حالات اس کے مقابلے میں اثباتِ خودی کا تصور پیش کر کے انھوں نے مروجہ طریق سے انحراف کیا۔ خود لکھتے ہیں:

> ...میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی قوی ہو گیا تھا مگر قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخِ اسلام کا مطالعہ کرنے کے نتیجے میں یہ ہوا کہ مجھے اپنی غلطی معلوم ہوئی اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا اور اس مقصد کے لیے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا...(۱)

گویا اقبال کی مذہبی و صوفیانہ تلمیحات پیغامبری کا موثر حربہ قرار پانے کے ساتھ ساتھ اس دور کے ہندوستان کے مذہب و تصوف پر مبنی تصورات کو سمجھنے میں بھی ممد و معاون ٹھہرتی ہیں۔ ذیل میں علامہ کی مذہبی و صوفیانہ ہر دو طرح کی تلمیحات کے مزاج کو فرداً فرداً بیان کیا جاتا ہے۔

(الف) مذہبی تلمیحات:

اقبال کی مذہبی تلمیحات میں غالب رجحان متذکرہ مذاہب میں سے اسلام، عیسائیت اور ہندوازم سے منسلک تصورات کے اہم اشارات فراہم کرتا ہے۔ خاص طور پر وہ ان تینوں مذاہب کی تلمیحات کے تال میل سے تفکر و تفلسف کے نئے باب رقم کرتے ہیں۔ اسلامی تلمیحات کی تعداد بہت زیادہ ہے اور علامہ کے ہاں اکثر و بیشتر دینی رنگ میں ڈوبے ہوئے اشارات ملتے ہیں جیسے قرآن (کتاب اللہ)، توحید، آئینِ پیغمبرؐ، کعبہ (حرم، قبلہ، بیت اللہ)، کلمہ (کلمہ گو)، تکبیر، آخرت، منبر و محراب، اعراف، اقرار باللسان، احرام (جامہ ہائے احرامی)، صلوٰۃ و درود، حدیث و کتاب، مؤذن، اذان، وضو، دعا (دعائے نیم شب)، نماز، رکعت، روزہ، حج، جہاد، شہادت (شہدا)، غازی، تسبیح (رشتۂ تسبیح، دانۂ تسبیح، تسبیح و مناجات)، وحی، مسجد، امام، قیام و سجود (نشانِ سجدہ)، شب زندہ دار، طواف، زمزم، عید محرم،، رمضان اور تفضیلِ علیؓ وغیرہ وہ اسلامی تلمیحی اشارے ہیں جن سے اقبال اپنے نظریات کا ابلاغ کرتے ہیں۔ اسی طرح اشعار میں عیسائیت کے ضمن میں زیادہ تر صلیب، کلیسا، رہبانیت (راہبی)، چلیپا اور پیرِ کلیسا یا پیر کنشت (پوپ)(۲) اور ہندو مذہب کے حوالے سے رام، گایتری، گیتا، دَیر، بت (مورت)، سومنات، منتر، پجاری، شکتی، شانتی، بھگت، ناقوس، ہری ہری، زنار، پاپ اور مکتی وغیرہ جیسے اشاروں سے معنویت کے در وا کرنے کی بھرپور سعی ملتی ہے۔ تاہم اس سلسلے میں امتزاجی اشارات ہر اعتبار سے فائق ٹھہرتے ہیں کہ ان کی معاونت سے اقبال نے طنز کے نادر اور بصیرت افروز نکات پیش کیے ہیں۔ چند شعر دیکھیے:

زمیں کیا، آسماں بھی تیری کج بینی کو روتا ہے — غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے (ب د، ۷۳)

کعبہ پہلو میں ہے اور سودائیِ بت خانہ ہے — کس قدر شوریدہ سر ہے شوقِ بے پروا ترا (" ، ۱۸۵)

ہو تری خاک کے ذرّے سے تعمیرِ حرم — دل کو بیگانۂ اندازِ کلیسائی کر (" ، ۲۷۹)

حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبت کو — مری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی (ب ج، ۴۴)

مسلماں ہے توحید میں گرمجوش — مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش (" ، ۱۲۳)

اُن شہیدوں کو دیت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ — قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر! (ض ک، ۵۵)

طلسمِ بے خبری، کافری و دینداری — حدیثِ شیخ و برہمن فسون و افسانہ (ا ح، ۴۱)

جہاں تک مختلف مذاہب سے وابستہ شخصی تلمیحات کا تعلق ہے، اس سلسلے میں اقبال نے امام مہدی، گوتم بدھ، رام چندر جی، بابا گورو نانک، محمد علی باب، علامہ زمخشری اور منزوک کی تلمیحوں کو پیوندِ کلام کر کے اپنے کلیدی تصورات کی تفہیم کرائی ہے۔ امام مہدی، اہلِ تشیع کے عقیدے کے مطابق بارہویں امام ہیں جن کی ولادت سامرا میں ہوئی(۳) مگر وہ ابتدائے عمر میں نظروں سے اوجھل ہو گئے تاہم

ہنوز زندہ ہیں اور قیامت سے قبل معینہ وقت پر ظہور کر کے فتنۂ دجال کا خاتمہ کریں گے۔ عام مسلمانوں میں بھی اس عقیدے سے اثر پذیری کے نتیجے میں مختلف اوقات میں مہدویت کے دعوے دار نظر آتے ہیں۔ علامہ نے متنازع مباحث سے قطع نظر کر کے مہدی کی شخصیت کو علامتی آہنگ میں تلمیح کیا ہے اور وہ اس کی وساطت سے اپنے کلام کی شدت وحدت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے بنیادی موقفات یہ ہیں کہ مہدی وہی ہے جس کی خودی پہلے نمودار ہو یا جو ہر طبقۂ انسانی کو جدتِ گفتار و کردار سے ہمکنار کر سکے، اسی سبب سے وہ نٹشے کے ''تصور فوق البشر'' میں اس کی جھلک دیکھتے ہیں اور ان کی بنیادی اصرار یہی ہے کہ مہدی کے تخیل و تصور سے بیزاری درست نہیں کہ یہ تصور سر تا سر انقلاب کی آمد سے وابستہ ہے، اقبال کے ہاں اس مذہبی تلمیح کی جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار — وہی مہدی وہی آخر زمانی (ب ج، ۸۹)

دنیا کو ہے اس مہدیِ برحق کی ضرورت — ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار (ض ک، ۴۴)

مجذوبِ فرنگی نے بہ اندازِ فرنگی — مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو (''، ۵۹)

اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار — نومید نہ کر آہوے مُشکیں سے ختن کو (""")

گوتم کا اصل نام سدھارتھ تھا اور اسے ساکیامنی بھی کہتے ہیں(۴) وہ اودھ سے ملحق سلطنت کے راجا کا بیٹا تھا جس نے جوانی میں علائقِ دنیوی سے علیحدگی اختیار کر کے بنوں کا رُخ کیا تا آنکہ اسے گیان حاصل ہوا اور وہ ''بدھ'' کہلایا۔ اس کے پیغام کا خلاصہ یہی ہے کہ ترکِ دنیا اور اخلاقی اقدار کی پابندی سے نروان کا حصول ہوتا ہے۔ اقبال کے ہاں گوم بدھ کے حوالے سے تحسینی تلمیح ملتی ہے جس کے ذریعے وہ اسے سراہتے ہیں اور اس امر پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ اس خطۂ خاک (ہندوستان) سے منسلک ہونے کے باوصف برہمن نے مئے پندار کے نشے میں اس کے مساواتِ انسانی پر مبنی مذہب کو پھلنے پھولنے نہ دیا اور یہ دوسرے خطوں چین، جاپان وغیرہ میں پروان چڑھا:

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی — قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی
آہ! بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر — غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا — ہند کو لیکن خیالی فلسفے پر ناز تھا
" " " " " " " " " "

برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں — شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں (ب د، ۲۴۰)

رام چندر جی مہاراج، جو اجودھیا کے راجا کے فرزند اکبر تھے۔ رامائن بالمیکی، ان ہی کے حالات پر مشتمل ہے۔ سناتن دھرمی ہندو ان کو خدا کا ساتواں اوتار مانتے ہیں۔ ان کی زندگی ایک مثالی زندگی تھی اور ان کی داستان میں ماں باپ کی اطاعت، قول کی پابندی، ظلم کے خلاف جہاد کے جو عناصر ملتے ہیں، ان کی اہمیت آفاقی ہے(۵) اقبال نے اس مذہبی شخصیت کا ذکر مدحیہ پیرائے میں بایں

طریق کیا ہے:

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز — اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اُس چراغِ ہدایت کا ہے یہی — روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوشِ محبت میں فرد تھا

(ب د، ۱۷۷)

بابا گورونانک شیخوپورہ کے قصبے تل ونڈی (ننکانہ صاحب) کے رہنے والے تھے۔ وہ آغاز ہی سے زیادہ تر غوروفکر میں مستغرق رہتے اور نوجوانی ہی میں علائقِ دینوی سے کنارہ کشی اختیار کر کے سیروسیاحت کے ذریعے خدا کی تلاش کرنے لگے۔ ان کی تعلیمات میں خدا کی وحدانیت حاصل ہے۔ اقبال نے سکھ دھرم کے بانی کے اس تصور وحدانیت کو نظر استحسان سے دیکھا ہے، لکھتے ہیں:

چشتی نے جس زمیں، میں پیغامِ حق سنایا — نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا (ب د، ۸۷)
پھر اُٹھتی آخر صدا توحید کی پنجاب سے — ہند کو ک مردِ کامل نے جگایا خواب سے ("، ۲۴۰)

شیرازی الاصل، مرزا محمد علی نے ۱۲۶۰ھ میں ایران میں مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے کہا کہ میں اس اعتبار سے باب ہوں کہ جب تک لوگ میرے افکار کے دروازے سے گزر نہ کریں گے، اس وقت تک ان پر یہ نکتہ روشن نہ ہوگا کہ امام مہدی اور مسیح موعود کب ظہور کریں گے۔ یہ شخص علم وفضل سے بہرہ مند تھا، حتیٰ کہ قرآن کے اعراب تک نہ جانتا تھا لیکن بڑے بڑے مبلغین اور دانشوروں کی تائید کے سبب اس کا مذہب تیزی سے مقبولیت حاصل کرنے لگا۔ جس پر حکومتِ ایران نے چن چن کر بابیوں کو قتل کیا اور ۱۸۵۰ء میں باب خود بھی مقتول ہوگیا۔ بعدازاں بہاء اللہ نے اسے نئی شکل دی اور آج یورپ میں بہائی مذہب کے لوگ موجود ہیں۔ علامہ نے باب کی بے علمی کو ہدفِ طنز بناتے ہوئے وہ تلمیحی واقعہ مرقوم کیا ہے جب اسے ناصر الدین شاہ قاچار کے زمانے میں گرفتار کر کے علما کی مجلس میں لایا گیا تو اس نے قرآنی آیات پڑھتے ہوئے لفظ سموات میں اعراب کی غلطی کی۔ جب علما متبسم ہوئے تو اس نے غلطی کی تعبیر یہ کی کہ میں نے قرآن کو اعراب کی قید سے آزاد کر دیا ہے۔ دیکھیے اقبال کس مہارت سے صرف تین شعروں میں اس قصے کو صفحۂ قرطاس پر اتار دیتے ہیں:

تھی خوب حضورِ علما باب کی تقریر — بے چارہ غلط پڑھتا تھا اعرابِ سمٰوٰت
اُس کی غلطی پر علما تھے متبسّم — بولا، تمھیں معلوم نہیں میرے مقامات
اب میری امامت کے تصدق میں ہیں آزاد — محبوس تھے اعراب میں قرآن کے آیات (ض ک، ۴۶)

کلامِ اقبال میں معتزلہ عقاید کے علامہ جاراللہ محمود بن عمر زمخشری، صاحب تفسیر کشاف کا تلمیحی تذکرہ صرف ایک موقعے پر ملتا ہے، لکھتے ہیں:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب　　گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف　　(ب ج،۷۸)

اسی طرح اقبال، ایران میں قباد کے زمانے میں ظہور کرنے والے پہلے اشتراکی مفکر مزدک (۵۱)، اس کے نئے مذہب اور مذہبی تحریک ''مزدکیت'' کو بھی صرف دو مقامات پر بطورِ تلمیح لائے ہیں، جیسے:

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے　　مزدکیت، فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے　　(ا ح،۱۲)

اقبال کے ہاں ان شخصی تلمیحات کے ساتھ ساتھ مذہبی واقعات کے اشارے بھی ملتے ہیں مثلاً ان کے کلام میں ہندوؤں کے اوتار شری کرشن کے اس مذہبی تاریخی واقعے کی جانب اشارہ ملتا ہے، جب اس نے مہابھارت کی لڑائی میں ارجن کو مذہبی تعلیم دی، جو آج بھگوت گیتا کی شکل میں موجود ہے(۶) اقبال، اسے ہند میں ''سرودِ ربانی'' سنانے سے موسوم کرتے ہیں (سنایا ہند میں آ کر سرودِ ربانی۔ ب د، ص۸۲)، اسی طرح وہ اس مذہبی آویزش کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جو ازمنۂ وسطیٰ میں رومن کیتھولک کلیسا اور حکما کے درمیان پیدا ہو گئی تھی اور جس کے نتیجے میں خوب قتل و غارت گری ہوئی، بالآخر کلیسا کی شکست کے بعد یورپ میں عقلیت کا دور دورہ ہوا۔ (لہو سے لال کیا سیکڑوں زمینوں کو+ جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے، ب د،ص۸۲) ان کے ہاں اسی ضمن میں پاپائیت کے کیتھولک مسلک کے خلاف جرمن مفکر مارٹن لوتھر کی پروٹسٹنٹ تحریک کا تلمیحی حوالہ یوں بھی آیا ہے:

دیکھ چکا المنی، شورشِ اصلاحِ دیں　　جس نے نہ چھوڑے کہیں عہدِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی، عصمتِ پیرِ کنشت　　اور ہوئی فکر کی کشتیِ نازک، رواں　　(ب ج،۹۹)

اقبال کی مذہبی تلمیحوں میں بعض اوقات مذہبی اشخاص و وقائع اور کتب و اصطلاحات کا موضوع کی مناسبت سے اطلاق بھی ملتا ہے مثلاً وہ فرقۂ اسماعلیہ کے پیر حسن بن صباح (ساحرالموط) کی شخصیت کا علامتی اطلاق سرمایہ دار آقاؤں پر کر دیتے ہیں جو بندۂ مزدور کو طرح طرح کے مسکرات میں الجھائے ہوئے ہے (ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش+ اور تو اے بے خبر، سمجھا اسے شاخِ نبات، ب د،۲۶۲)، زیادہ وہ زرتشت کے صحیفے پاژند کو غیر اسلامی تصورات کی علامت بنا دیتے ہیں (احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر+ تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند۔ ب ج،۲۰) یا پھر مذہبی اصطلاح ''غیبتِ صغریٰ'' (امام مہدی کا کچھ عرصے کے لیے غائب ہو جانا) کا اطلاع سر راس مسعود کی وفات کے حوالے سے یوں کر دیتے ہیں:

ہوا جو خاک سے پیدا، وہ خاک میں مستور　　مگر یہ غیبتِ صغریٰ ہے یا فنا کیا ہے؟　　(ا ح،۲۵)

گویا مذہبی تلمیحات میں علامہ نے مختلف مذاہب کے حوالے سے تلمیحات کے خوب خوب پہلو نکالے ہیں جو بلاشبہ جدّت سے ہمکنار ہیں۔

(ب) صوفیانہ تلمیحات:

اقبال کی صوفیانہ تلمیحات میں متصوفانہ اصطلاحات و اشارات کے ساتھ ساتھ صوفیائے کرام کی شخصی تلمیحیں نہایت کارگر اور

جاندار ہیں۔ وہ فقر، کرامات، مقام شوق و سرور و نظر، ضربِ کلیم، خانقاہ (خانقہی سلسلہ)، صوفی، عارف، مرید و شیخ، رندی و سرمستی، بندۂ حُر، ذکر و فکر، خلوت و جلوت، شریعت و طریقت، احوال و مقامات، سلوک و سالک، تقدیر (جبر و قدر)، وحدۃ الوجود، حجابِ وجود، خبر و نظر، ذوق آتش آشامی، باطن و ظاہر، نفیِ ہستی، معجزات، ذکرِ نیم شبی، مراقبے، قوالی، قلندر، تسلیم و رضا، موجود و لاموجود، پیرانِ طریق، ہمہ اوست، غیب و حضور، اندیشۂ عجم، کشاکشِ من و تو اور علم و عشق جیسے اشارات کو ترسیلِ معنی کے لیے متنوع پیرایوں میں مستعار لیتے ہیں جب کہ صوفیانہ شخصیات کی تلمیحوں(۷) میں علامہ نے ''وحدۃ الوجود'' اور ''وحدۃ الشہود'' دونوں سے متعلق صوفیائے کرام کے تذکرے سے کلام کی معنویت کو دوچند کیا ہے۔ ان میں حضرات بایزید بسطامی، جنید بغدادی، منصور حلاج، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، خواجہ نظام الدین اولیا، شیخ احمد سرہندی اور سوامی رام تیرتھ جیسے صوفیا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پھر سب سے بڑھ کر وہ اپنے پیر و مرشد مولانا روم سے انجذاب و اکتساب کرتے ہیں اور ان کی شخصیت اور کلام اکثر مواقع پر تلمیحی رنگ میں اپنی جھلک دکھاتا ہے(۸) اسی سلسلے میں معروف وحدۃ الوجودی ابنِ عربی کی تلمیح اقبال کے کلام میں شعری طور پر تو نہیں ملتی البتہ انھوں نے تقدیر کے مسئلے کی وضاحت کے لیے ان کی کتاب سے ابلیس و یزداں کی گفتگو ماخوذ کی ہے۔

ان صوفیائے کرام کی تلمیحات کا جائزہ لیں تو اقبال کا اُسلوب ان سے متنوع معنی اخذ کرتا دکھائی دیتا ہے(۹) ابتدائی دور کے صوفیا میں وہ بسطام کے معروف صوفی بایزید طیفور البسطامی کی عبادت، زہد و تقویٰ اور محبتِ رسول اور سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کی فقر و غنا اور توکل پر مبنی شخصیات کو پیشِ نظر رکھ کر تحسینی تلمیحات سپردِ قلم کرتے ہیں۔ ان کے مطابق ایسی ہستیوں کے سامنے ہر قسم کی شان و شکوہ ہیچ قرار پاتی ہے اور یہ ہر دور کے مسلمان کے لیے باعثِ حرکت و حرارت ہیں۔ (عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں + شکوہِ سنجر و فقرِ جنیدؒ و بسطامیؒ — ب ج، ۷۳) اقبال نے سرزمینِ فارس سے متعلق صوفی منصور حلاج کے ''نعرہ انا الحق'' کو وحدۃ الوجود کے عقیدے کے منطقی نتیجے کے طور پر دیکھا ہے اور وہ اس یگانہ شخصیت کے ''انا الحق'' کہنے اور اپنی تصنیفات میں اسی قبیل کے تصورات پیش کرنے پر خلیفہ عباسی المقتدر کے حکم پر پھانسی کی سزا پانے کو ستائشی انداز میں دیکھتے ہیں اور اس کا رشتہ خودگیری، خودداری اور آزادی کے ساتھ جوڑ کر اپنے بنیادی تصورات کا ابلاغ مؤثر طور پر کرتے ہیں:

منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت — اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی (ب د، ۱۰۲)

رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی — کہ وہ حلاج کی سُولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا (ب ج، ۲۳)

مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن — زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی (ض ک، ۱۴۲)

خودگیری و خودداری و گلبانگ 'انا الحق' — آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات (ا ح، ۳۸)

اقبال نے اپنے کلام میں خواجۂ خواجگان، پیرِ سنجر، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے فیوض باطنی اور بالخصوص ہند میں ان

کی بے مثال تبلیغِ دین کو سراہا ہے۔ (چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا — ب د، ۸۸) اور وہ حضرت محبوب الٰہی (خواجہ نظام الدین اولیا) کے تصوف و شریعت پر مبنی پیغام کو بے حد تحسینی انداز میں یوں تلمیح کرتے ہیں:

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا — بڑی جناب ہے تیری، فیض عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم — نظامِ مہر کی صورت نظام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی — مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی — بڑی ہے شان، بڑا احترام ہے تیرا (ب د، ۹۶)

اسی طرح علامہ سلسلۂ نقشبندیہ کے صوفی شیخِ مجددؒ، شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور انھوں نے جس طرح ہندوستان میں اصلاحِ دین کی کاوش کرتے ہوئے اکبر کے ''دینِ الٰہی'' کا سدِ باب کیا اور بعدازاں اس کے فرزند جہانگیر کے سامنے سجدۂ تعظیمی کرنے سے انکار کر کے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، ان کے باعث اقبال انہیں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ اس موقعے پر اس صوفیانہ تلمیح کا ستائشی رنگ دیدنی ہے، لکھتے ہیں:

حاضر ہوا میں شیخِ مجدد کی لحد پر — وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
اس خاک کے ذرّوں سے ہیں شرمندہ ستارے — اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیری کے آگے — جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں — اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار (ب ج، ۱۵۸، ۱۵۹)

صوفیانہ اشخاص ہی کی تلمیحات کے سلسلے میں اقبال کے ہاں سوامی رام تیرتھ کی تلمیح بھی ملتی ہے جو وحدۃ الوجود سے مماثل تصور ''ویدانت'' کے قائل تھے اور ہندوستان میں ان کی رام بھگتی (رام سے عشق) کا بہت چرچا تھا۔ رام سے محبت کی انتہا یہ ہے کہ وہ حالتِ جذب و مستی میں نذرِ آب ہو گئے تھے۔ علامہ ان کے اس عشق اور وحدۃ الوجود پہلو کو تحسینی نگاہ سے دیکھتے ہوئے یوں تلمیح کرتے ہیں:

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بے تاب تو — پہلے گوہر تھا، بنا اب گوہرِ نایاب تو
آہ! کھولا کس ادا سے تو نے رازِ رنگ و بو — میں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیازِ رنگ و بو
" " " " " " " " " " " "

نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا — 'لا' کے دریا میں نہاں موتی ہے الّا اللہ، کا (ب د، ۱۱۴)

اقبال کی مذہبی و صوفیانہ تلمیحات پر مبنی زاویے نہایت پُرکار ہیں اور ان کے بنیادی نظریات کے ساتھ ان کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ انھیں کسی اعتبار سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یوں یہ شاعر کی تلمیحات کا ایک بڑا نادر حصہ قرار پاتا ہے۔

حوالے:

(۱) مکتوب بہ نام خواجہ حسن نظامی مشمولہ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، (مرتبہ) مظفر حسین برنی، لاہور: ترتیب پبلشرز، س ن، ج ا، ص ۳۳۹، ۳۴۰

(۲) دیکھیے مضمون: ''علامہ اقبال کی شاعری میں روح القدس کی اصطلاح'' مشمولہ علامہ اقبال اور مسیحی اصطلاحات، لاہور، مسیحی اشاعت خانہ، طبع سوم ۱۹۸۹ء، ص ۱۶۸

(۳) سیروس شمیسا، ڈاکٹر: فرہنگِ تلمیحات، تہران: انتشارات فردوس، طبع چہارم ۱۳۷۳، ص ۵۶۶

(۴) عابد علی عابد، سید: تلمیحاتِ اقبال: بزمِ اقبال، طبع دوم، ۱۹۸۵ء، ص ۶۷

(۵) ایضاً، ص ۳۱

(۶) اکبر حسین قریشی، ڈاکٹر: مطالعۂ تلمیحات و اشاراتِ اقبال، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، طبع دوم ۱۹۸۶ء، ص ۲۱۱، ۲۱۲

(۷) تفصیل کے لیے دیکھیے: اقبال کے محبوب صوفیا از اعجاز الحق قدوسی، لاہور اقبال اکادمی پاکستان، طبع اول جنوری ۱۹۷۶ء

(۸) دیکھیے: اقبال کے شعری ماخذ مثنوی رومی میں از سید وزیر الحسن عابدی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء

(۹) ملاحظہ ہو: اقبال کے کلام میں صوفیائے کرام کی تلمیحات (مضمون) جمیل نقوی مشمولہ تفسیر اقبال، سری نگر کشمیر: گلشن پبلشرز ۱۹۸۲ء، ص ۱۴۴

مقالاتِ مرزا محمد سعید

مرتب

شیما مجید

صفحات: ۲۰۶ قیمت: ۱۴۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

اقبال کا تصور اسلام

سید اظفر رضوی

تاریخ گواہ ہے کہ سرزمین عرب کے تہذیبی ارتقا میں ''تصور اسلام'' ہر پیغمبر کے عرصہ حیات اور حالات کے تقاضوں کا امین تھا اور بلاشبہ ہر پیغمبر نے اپنے دور کے موجودہ مذہبی اعتقادات سے بغاوت کے بعد انقلاب برپا کیا جس سے انسانیت کو فکر و تدبر اور تعلیم کی روشن راہ نصیب ہوئی۔ حکم الامت علامہ اقبال نے اس پہلو کو نمایاں کرتے ہوئے اسلام کا تصور یوں بیان کیا کہ:

فطرت کو خرد کے روبرو کر
تسخیر مقامِ رنگ و بو کر
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اُس سے نہ ہو سکا وہ تو کر!

اس پس منظر میں ہمیں اس امر کا جائزہ لینا ہے کہ سرزمین پاک و ہند میں علامہ اقبال نے دورِ غلامی سے نجات کے لیے ''اسلام'' کو اپنے کلام کے ذریعے کس طرح اخوت، محبت، رواداری، آزادی، انسان دوستی اور پاکیزگی کا ذریعہ بنایا ہے آج سرزمین پاکستان پر یہ بحث عام ہے کہ اگر تاریخ آزادی کے کارکن کا دعویٰ تسلیم کرلیا جائے کہ پاکستان کا قیام دراصل علامہ اقبال کا خواب تھا تو سرزمین پاک کی موجودہ سیاسی، سماجی، معاشی صورت حال کو خواب اقبال کی حقیقی تعبیر ہی قرار دیا جائے گا یا نہیں؟

اس بحث کے مختلف پہلوؤں پر علمی، ادبی اور نظریاتی زاویہ نگاہ سے تجزیہ کیا جائے تو یقیناً خود تنقیدی کے ذریعے پاکستانی قوم کے عوام اور حکام اپنے مستقبل کو مزید بہتر کرنے کی حکمت عملی طے کرنے کی فکر کر سکتے ہیں۔ اس پس منظر میں یہ دلیل توجہ طلب ہے کہ ہم اقبال کے تصور اسلام کی بحث کو دور جدید میں لایعنی بحث قرار نہ دیں بلکہ اپنے احوال و کوائف کی بے سمتی کے منظر کو بدلنے کی خواہش، آرزو اور تمنا کو اپنے قلب و نظر میں زندہ رکھنے کا پختہ عزم کریں تو یقیناً سنگ دلانہ بے حسی کے مرض سے چھٹکارا حاصل کرنے کا نسخہ شفا میسر آسکے گا۔

پاکستانی ثقافت میں ''اقبال، تصور اور اسلام'' کی تثلیث دراصل پاکستانی تاریخی پہچان کا نشان ہیں علامہ اقبال کی شخصیت کی

پہچان میں تعلیم، شاعری، فلسفہ اور سیاسیات کے وہ بُنیادی چار ستون ہیں جن سے ہم اقبالیات اور ''اقبال کے تصور اسلام'' کا منظر دیکھ اور پرکھ سکتے ہیں۔ اس نکتہ کی وضاحت یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ حکیم الامت شاعر مشرق علامہ اقبال نے ''اسلام'' کی بحیثیت شاعر، فلسفی، معلم اور سیاست دان کے کس کس انداز میں تشریح وتعریف کی اور اپنے دور کے مسائل و مشکلات اور انسانی وقار و احترام کو جہالت، ظلم اور حکمران طاقتوں کی زنجیروں سے نجات دلانے کے لیے ''اسلام'' کے پیغام کو کس حد تک عدم تشدد، تحمل، رواداری، انسان دوستی اور انسانی امن وسلامتی، کی محکم اساس فراہم کی، یعنی ایسی فکری بنیاد جس سے نئی نسل جدید زمانے کی تیز رفتار اور سائنس وٹیکنالوجی کے انکشافات کی نئی عالمی فضا کو اخلاقی اقدار کی روشنی سے مربوط اور ہم آہنگ رکھنے کی قوت حاصل کر سکے۔ اس منزل اور مقام کی تفصیلات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہمیں نئی نسل کے اس اہم سوال کو اہمیت دینا ہوگی کہ اقبال اپنے دور کے اجتماعی ضمیر کو جگانے کی ترقی پسندانہ پیش قدمی کا سرخیل تھا یا نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس سوال کا جواب سرزمین پاک و ہند بلکہ عالمی ادب میں ہمارے دور کے عظیم ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض نے دیا ہے، فیض احمد فیض کی نظم ''اقبال'' کا مفہوم ومطلب یوں ہے:

> ''ہماری دیس میں اک خوش نوا فقیر آیا، اور اپنی دھن میں غزل خوانی کرتا چلا گیا اُس کی غزل خوانی کی دھن سے عوام تازہ دم ہو گئے بلکہ سنسان راہیں خلق خدا سے آباد ہو گئیں اور دل و نگاہ میں سرمستی کی وجہ سے ویران محفلیں رنگ و نور سے سج گئیں۔ اس خوش نوا فقیر کی دھن کو چند لوگ ہی جان سکے مگر کم نظر کی وجہ سے چند باصلاحیت اور باخبر لوگ ہی اپنی نگاہ کو اس کی اصل حقیقت کے قریب لا سکے مگر اس کی غزل خوانی کا روحانی اثر تمام دلوں میں اثر انداز ہوا۔ وہ بادشاہ جو فقیرانہ انداز رکھتا تھا اب دور جا چکا ہے اور اپنے دیس کی راہیں پھر سے اداس ہیں اس کی کوئی ادائے خاص گنتی کے چند لوگوں کو یاد ہے یا پھر چند عزیزوں کے پاس اُس کی نظریاتی اساس کے پہلو موجود ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے مگر اس حقیقت کے باوجود اس کا گیت ادب شناس لوگوں کے قلب ونظر ہی میں نہیں بلکہ عام خلق خدا کے دلوں کی حساس دنیا میں بھی موجود ہے اس کی دھن اور لے سے اکثر لوگ نورِ لذت سے فیض حاصل کرتے ہیں۔''

فیض صاحب نے اپنے خیالات میں اس اہم سوال کی نشان دہی کی ہے کہ اقبال کے حسن کلام سے آیا آج بھی فیض یاب ہونے کی صلاحیت اور قوت یا ذوق وشوق موجود ہے یا نہیں۔

سماجی سائنس کے عام طالب علم کے لیے یہ بات نئی نہیں کہ موجودہ دور میں آرٹ کے علم وفن کو عصر جدید کی نفسیات سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے اور سائنسی طرز فکر یعنی ''مشاہدہ، تجربہ تجزیہ کے عقلی نتائج'' کے ہتھیار کے ذریعے دور جدید کے میدان عمل میں سرگرم عمل ہونے کی طاقت حاصل کی جاسکتی ہے۔ علامہ اقبال نے اس جدت کی اساس کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ:

خود ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل
عذاب دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

علامہ کی مشہور زمانہ کتاب ''ضربِ کلیم'' کی ایک نظم کا عنوان ہی ''اسلام'' ہے اس نظم میں علامہ نے یورپ کی ''اسلام'' سے کدورت کا ذکر کیا ہے لیکن اُن کی اس منفی سوچ کو بدلنے کے لیے انسانی تاریخ کا نچوڑ بتایا ہے کہ آپ اس لفظ سے کدورت ختم کریں یا نہ کریں مگر اس نام کی تہہ میں غیرت، امن، عزت، وفا، محبت، انسانی عظمت اور تحمل اور عدم تشدد کا جذبہ موجود ہے لہٰذا ہر دور کا انسان ان اخلاقی اقدار کے حصول کے لیے اپنے اپنے دائرہ کار اور میدان مفادات و ترجیحات میں اگر ان سے بے لگام ہوگا تو انسانیت پر ظلم و زیادتی، تشدد، نفرت کے سیاہ بادل چھا جائیں گے، اور یہ دنیا جہنم کی سی آگ کی تپش سے برباد ہو جائے گی لہٰذا ''اسلام'' محبت و اخوت انسانی اور احترام آدمیت کا پیغام دیتا ہے جو ہر دور میں انسانی اخلاق کی تعمیر کی منزل مقصود ہے۔

علامہ اقبال کے تصور اسلام سے عقل و فکر کے تحریکی جذبے اجاگر ہوتے ہیں جس سے شاعر کی ہستی کا شعلہ دراصل اُس کے فن کو بقائے دوام بخش دیتا ہے۔ شعر و ادب کے دربار بقائے دوام میں کسی بھی فنکار یا تخلیق کار کا شعلہ خو ہونا، شعلہ رو ہونا، شعلہ زن ہونا، یا شعلہ فشاں ہونا یقیناً اس کی ہستی کے اضطراب، بے چینی اور بے قراری کا مظہر ہوتا ہے۔ شاعر اپنی ذات اور فن کے میدان عمل میں عشق و مستی اور والہانہ پن کے ایسے چراغ روشن کرتا ہے جس سے عام لوگ اپنے قلب و نظر کو جہالت کے اندھیروں سے نکالنے کا اہم ذریعہ سمجھتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بحیثیت شاعر، فلسفی، معلم اور سوشل سائنٹسٹ کے نہ صرف یہ اپنے دور کے سکوت، خاموشی اور غلامانہ بے بسی کے ماحول کو تبدیل کرنے کے لیے چیخ و پکار کی بلکہ والہانہ وجد سے دھمال کا سماں بھی پیدا کیا جس سے انقلابی روح پیدا ہوئی اور ''تحریک آزادی'' کو کامیابی کے چار چاند لگ گئے۔ علمی تقاضا یہ ہے کہ ''اسلام'' کے لفظی معانی کو سامنے رکھا جائے جو تحریک اسلام سے قبل بھی عام عربوں میں مستعمل تھے ''اسلام'' کے لغوی معنی ''خود سپردگی، جھک جانا خود کو حوالے کر دینا'' تحریک اسلام میں جو لوگ حضور پاک کی تعلیم کو ان کی قیادت کے سامنے اپنے آپ کو جھکا دینے کا اقرار کر لیتے تھے انھیں شرعی اصطلاح میں ''اسلام کا پیروکار'' خیال کیا جاتا تھا یعنی وہ پیغام جو پیغمبر اسلام نے اپنے دور میں عربوں کو دیا وہ ''اسلام'' ہو گیا۔ عربوں کے دین اور دین اسلام میں یہ فرق نمایاں ہوا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے الفاظ مثلاً اللہ، دین، قرآن، صلوۃ، صوم، حج کے تمام الفاظ انقلاب اسلام کے بعد رحمت و برکت سے نئے معانی اور نئے افق سے آشنا ہوئے اور انقلاب اسلام نے ان لفظوں کو جمود کی حالت سے نکال کر متحرک کر دیا علامہ اقبال اس انقلابی فکر اور تحریک کو اپنے حالات میں بھی زندہ رکھنے کی سعی و کاوش کرتے رہے۔ اُن کے نزدیک ''اسلام کا تصور'' کسی قسم کے جمود کو نام نہ تھا بلکہ انسانیت کو متحرک رکھنے کا وسیلہ اور ذریعہ تھا تاکہ جہالت کے ایسے تقدسات کو مسمار کیا جا سکے جو انسانی احترام، مساوات، ترقی و خوشحالی، رواداری اور علمی سربلندی کے سفر کو روکنے کا موجب بنتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنی کتاب تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ

Reconstruction of Religious thoughts in Islam میں اس عصری دینی ضرورت کو اجاگر کرنے کی علمی کوشش کی ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ملائیت کے زیر اثر ہمارے پاکستانی سماج میں علامہ اقبال کی اس قیمتی علمی متاع سے فیض یاب ہونے کی کسی بھی علمی و فکری اور سیاسی تحریک نے کوشش نہیں کی تاکہ پاکستانی قوم جدید دور کی نمائندہ اور معتبر قوم بن سکے، نئی نسل کا فرض ہے کہ وہ اس ''فردوس گم گشتہ'' کی آبیاری کرے اور اپنے صحن کو سرسبز و شاداب اور جنت نظیر بنا سکے۔ ''اقبال کے تصور اسلام'' کا مقصود ہی یہ تھا کہ آزادی فکر سے لیس ہو کر عوامی فلاح و بہبود کی مثالی ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے جس میں عدم تشدد، تحمل، مزاجی، امن اور علم دوستی کی ایسی پرنور فضا ہو جو اقوام مشرق و مغرب کے لیے باعث رشک ہو سکے۔ بلاشبہ یہ نصب العین قابل عمل ہے اور قابل حصول بھی۔ آپ یورپ کی ترقی، چین و جاپان کی ترقی اور انقلاب ایران کی سماجی بیداری سے یقیناً اپنے عزم کو پختہ اور حوصلوں کو بلند تر کر سکتے ہیں اور یہ کام ہر طالب علم اپنے اپنے دائرہ کار میں ذمے دارانہ انداز سے نبھانے کا عملی مظاہرہ کرے تو یقیناً منزل کا حصول آسان تر ہوگا اور اجتماعی قیادت بھی فطری طور پر سامنے آجائے گی۔

اقبال کے تصور اسلام کے عنوان میں ''تصور'' کے عام لفظ کے مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے تصور کے لغوی معنی ہیں ''دل میں تصویر بنانا، دھیان، مراقبہ، خیال، سوجھ۔ منطق کی اصطلاح میں کسی چیز کا حکم کے بغیر عقل میں آنا۔

تصور دراصل ذہنی حسیاتی اور فکری کیفیت کا نام ہے اور محسوسات کیہ عالم میں کسی رنگ، آواز اور نقش، اور خیال کو بھی تصور کہا جائے گا۔ اقبال کے تصور اسلام میں ہر انسان اپنے اخلاق کو حسن بخش سکتا ہے اور اس میں درجہ ذیل خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو علامہ اقبال کی شعری اور نثری تحریروں اور علمی کاوشوں کا نچوڑ ہے جسے آج کے دور میں بھی انسانی فلاح کا پاکیزہ سفر قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

۱) خودداری: انسان، بے نیاز اور خوددار ہو جاتا ہے وہ اپنے اعمال کے احساس ذمے داری سے لاپرواہ نہیں ہوتا۔

۲) مساوات: وہ دوسرے انسانوں کو اپنے برابر اور باعث احترام سمجھنے لگتا ہے کہ دوسرے انسانوں کے دکھ، خوشی کو اپنی ذات کا حصہ سمجھنے اور ان کی فلاح و بہبود کی تدبیر کرتا ہے، اپنی زبان سے اور اپنے عمل سے بھی۔

۳) انکساری: اللہ کے سامنے بے بسی کے اقرار سے منکسر المزاج ہو جاتا ہے اور دوسرے انسانوں کے سامنے خود کو بے بس محسوس نہیں کرتا۔ اعمال صالحہ اور خدمات خیر کا مرکز بننے کی کوشش کرتا ہے۔

۴) وسعت نظر: تنگ نظر نہیں ہوتا۔ سارے جہاں کی خیر اور سلامتی کا نہ صرف طلب گار ہوتا ہے بلکہ اپنے عمل سے تشدد اور ظلم سے پرہیز کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ امن اور آشتی اور صلح جوئی سے زندگی گزارنے کا طریقہ سیکھ لیتا ہے۔

۵) اطمینان اور تحمل: اللہ تعالیٰ کو اپنی شہ رگ سے قریب رکھنے کا احساس ''اطمینان'' کی کیفیت بخشتا ہے اور غصہ اور نفرت کی منفی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔

۶) رجائیت اور امید پرست: اپنی ہستی کے تمام تر جذبات و احساسات کی ایسی تربیت کرتا ہے کہ ناامیدی مایوسی اور بے چارگی کی اذیت

اور دکھ کی قید سے آزاد ہوتا ہے، اللہ کے فضل و کرم کی تلاش میں پیش قدمی کا حوصلہ رکھتا ہے۔

۷) محتاط رویہ: یعنی ظاہر و پوشیدہ اعمال و حرکت کو دیکھنے والا اللہ ہے، اس ایمان کے بعد وہ اپنے ظاہر و باطن میں محتاط ہو جاتا ہے اور گناہ نہیں کرتا۔ ایمان کی روشنی سے کبھی اپنے آپ کو اندھے پن کا شکار نہیں ہونے دیتا۔

۸) توکل بھروسہ اور اعتماد: اپنے وجود کی بقا و سلامتی کے لیے پریشانی سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ خود یہ بھروسہ اور اعتماد کرتا ہے اور دوسرے انسانوں کے معاملات، اخلاق اور معاشرتی رویوں میں توازن اور پاکیزگی کا باعث بن جاتا ہے۔ اقبال کے تصور اسلام میں تمام تر مقصد حرکات و سکنات نتیجہ خیز بلکہ انقلاب پرور نہیں ہو سکتیں جب تک ''انسان کی روح'' شامل نہ ہو۔

۹) ضبطِ نفس: اسلام کی تربیت ضبط نفس کا باعث ہوتی ہے، اور اگر ہم اپنے نفس پر ضبط نہ رکھ سکیں تو پھر ''اسلام کا تصور'' حقیقی طور پر کوئی اثر نہیں رکھے گا۔ یہی آرزو علامہ اقبال کی ہے کہ مسلمان فرد اور معاشرہ اور قوم جدید احساس ضبط نفس سے مالا مال ہوتا کہ ترقی و خوش حالی کا سفر طے کر سکے۔

۱۰) ظریف و خوش مزاج: علامہ اقبال کو حکیم الامت کہا جاتا ہے یعنی امت کا معالج، اس سلسلے میں ایک اہم واقعہ یوں ہے کہ ان کے ایک دوست نے کہا کہ آپ حکیم کیسے ہیں۔ جب آپ نے جب اور ڈاکٹر وغیرہ کی سند حاصل ہی نہیں کی لوگ آپ کو ''حکیم'' کیوں کہتے ہیں۔ علامہ اقبال نے جواب میں کہا کہ میرے پاس ایسا نسخہ ہے جس سے لوگ آپ کو بھی ''حکیم'' کا خطاب دے دیں گے۔ وہ نسخہ یہ ہے کہ مجھے بزرگوں کی صحبت سے یہ توفیق نصیب ہوئی کہ کروڑ بار میں نے درود شریف کا ورد کیا اور اس کے صدقے اور برکت کے طفیل لوگ مجھے ''حکیم الامت'' کہتے ہیں۔

علامہ اقبال نے بالِ جبریل کی نظم ''جاوید کے نام'' میں اس نکتے کو یوں واضح کیا ہے کہ:

ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبال
کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ

اقبال کے تصور اسلام عام انسانوں کو بھی حسن ارادت کی شمع جلائے رکھنے کا عملی ثبوت ملتا ہے اس لیے وہ تاریخ اسلام سے عبرت حاصل کرنے اور عام مسلمانوں کے لیے حسن عقیدت کو زندہ رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اقبال کا تصور اسلام مناجات و تسبیحات کے اثر سے پرامن زندگی اور اطمینان قلب کی دولت کا وسیلہ ہے ور وہ کسی بھی الہام وجدان عرفان اور روحانی تجربے کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں جس سے انسانی وحدت پارہ پارہ ہو جاتی ہے:

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقل خدا داد
ہے مرد خدا! تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو گر یاد
مسکین و محکوی و نومیدی، جاوید
جس کا تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

علامہ اقبال کا ''تصور اسلام'' جدید دور کے لیے ایسا دلکش پیغام ہے جس سے ہر عام و خاص رہنمائی حاصل کرسکتا ہے اہل علم رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں اس ابدی سچائی سے فیض حاصل کرنا دراصل انسانی فلاح بہبود اور عمل صالح کا ثبوت ہے مگر وہ لوگ جو جمود زدہ ذہن اور بت پرستانہ خصلت کے شکار ہو جاتے ہیں وہ اس ابدی سچائی سے بھی اپنے دل و دماغ کو روشن کرنے کی بجائے انسان کو جہالت کے اندھیروں میں ڈالنے کا موجب بن جاتے ہیں۔ مثلاً مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے علما کو ہمیشہ بت پرستانہ ذہنیت کا مقابلہ کرنا پڑا اور ظلم و بربریت کی چکی میں پسنا پڑا ہندوستان کے مسلمانوں نے جب شاہ ولی اللہؒ کے قرآن کریم کے فارسی ترجمے کو دیکھا تو اس دور کی ملائیت نے ان پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا حالاں کہ اس وقت ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی تھی اور ان کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ عربی زبان سے ناآشنا ہیں وہ بھی قرآن کریم کی بارگاہ سے فیض یاب ہو جائیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ حادثہ بھی رقم ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ناکام ہوئی اور ہر طرف مایوسی بے بسی بددلی کا سماں تھا مگر سرسید احمد خان نے اس صورت حال میں مسلمانوں کی ترقی اور بقا کے لیے ''تصور اسلام'' کے پس منظر میں راہ عمل کا تعین کیا اور ثابت کیا کہ اندھی طاقت کا مقابلہ علم کے چراغ جلا کر کیا جاسکتا ہے۔ یوں مصور پاکستان علامہ اقبال نے بھی شاہ ولی اللہ اور سرسید احمد خان کی پیروی کرتے ہوئے ''روحِ تصور اسلام'' کو زندہ رکھنے کی سعی و کاوش کی اور خلافت عثمانیہ کے ختم ہونے کے بعد عالم اسلام کی بے چارگی کو آس و امید کی روشنی دکھائی اور فرمایا:

اگر عثمانیوں پہ کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اقبال کے تصور اسلام میں آسمانوں پر ہزاروں ستاروں کے غائب ہونے میں جو اندھیرا چھا جاتا ہے اس کے بعد قدرت اور فطرت انسانیت کو صبح کاذب و صبح صادق سے روشناس کراتی ہے۔ لہٰذا اقبال کا تصور اسلام دراصل ہر دور میں زندگی کی بقا اور انسانیت کی فلاح کے حصول کی تگ و تاز کا نام ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''ضربِ کلیم'' میں ''اسلام اور مسلمان'' کے عنوان سے بیشتر مختصر نظمیں تحریر کیں جو ان کے

افکار و خیالات اور نظریات کو واضح کرتی ہیں وہ اپنے ''تصور اسلام'' میں اپنے مقام کا تعین کرتے ہوئے فیصلہ سناتے ہیں کہ مجھے قدرت نے ایشیا کا خس و خاشاک عطا کیا مگر میرا تصور اسلام کا شعلہ ایسا پرنور اور بے باک ہے۔ جس سے ایشیائی ممالک کے عوام و حکام اپنی عظمت رفتہ کو حاصل کرنے کے لیے موجودہ حالات میں بھی متحرک و مستعد ہو سکتے ہیں:

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الہ الا اللہ

علامہ اقبال کا تصور اسلام اور ملایت کے مذہبی تصورات میں تضاد اور تصادم کی فضا سے ہر تاریخ کا طالب علم آشنا ہے اور اس حقیقت کو جانتا ہے کہ ملائیت کے قائدین نے خود تنقیدی کا فکری رویہ نہیں اپنایا اور ماضی کے بتوں کی پرستش میں مصروف رہنے میں ہی نجات کا تصور دیا جس کی تصویر علامہ اقبال نے یوں نقش کی ہے:

اسی قرآن میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

علامہ اقبال نے ''ملائے حرم'' میں بھی اپنے تصور اسلام سے اہل فکر و دانش کو روشناس کرانے کی سعی و کاوش کی ہے اور جدید دور کے سماجی انقلابات کے ساتھ ساتھ احترام آدمی کے مقام کو روح اسلام قرار دیتے ہوئے کہا کہ:

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے پوشیدہ ہے آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے میری سحر کا پیام

علامہ اقبال کی اس نظم کے مفہوم سے مطابقت رکھتی ہوئی ایک نظم امریکی استاد نے اسی دور میں کہی تھی، The voice of God

صدائے ربانی

I sought to hear the voice of God
And climed the top most steeple
But God declared "Go Down Again"
I dwell among the people

ترجمہ:

میں صدائے ربانی کو سننے کی خواہش لے کر معبد کے مینار کی بلندی کی چوٹی پر گیا صدا آئی کہ نیچے اتر
جاؤ، میں عوام میں رہتا ہوں۔

علامہ اقبال نے ہندوستانی خانقاہیت کو بھی برہمنیت سے آزاد کرنے کی ترغیب دی۔ جوان کے تصور اسلام کی واضح دلیل ہے۔ اُن کی مشہور زمانہ نظم ''نبوت'' میں جو پیغام ہے وہ ان کے تصور اسلام کی وضاحت کرتا ہے جو آج بھی نئی نسل کے لیے رہنمائی کا ذریعہ ہے اور عصر نو کی شب تاریک میں روح اسلام کے چراغ جلانے کی عقلی راہ دکھاتا ہے:

میں نہ عارف، نہ مجدد، نہ محدث، نہ فقیہہ
مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام
ہاں، مگر عالم اسلام پہ رکھتا ہوں نظر
فاش ہے مجھ پہ ضمیر فلک نیلی فام
عصر حاضر کی شب تار میں دیکھی میں نے
یہ حقیقت کہ ہے روشن صفت ماہِ تمام
''وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام''

علامہ اقبال کے ''تصور اسلام'' کو سمجھنے کے لیے یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ انھوں نے مشرقی ملائیت اور مغربی ملائیت پر تنقید کے ساتھ ساتھ عالمی سطح کے ظالمانہ نظام اور اس کی پیدا کردہ تہذیب وتمدن پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور روح عصر کو اصل تصورِ فطرت سے ہم آہنگ رکھنے کی آرزو کو نمایاں کیا ہے۔ ان کی مشہور زمانہ نظم ''مکہ اور جنیوا'' آج کے دور میں بھی غور طلب ہے اور ملّت اسلامیہ کے قائدین کو محکم اساس فراہم کرتی ہے:

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم
تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم

آج کے جدید ذہن میں گلوبل ویلج کا تصور عام کیا جارہا ہے اور علامہ اقبال نے اسی خیال کو ملّتِ آدم کی ادبی اصلاح میں واضح کر دیا تھا لہٰذا پاکستان کی فضاؤں میں اس امر کی اہم ضرورت ہے کہ رنگ ونسل مذہب، زبان اور علاقے کی تنگناؤں سے بلند ہو کر انسانیت بلکہ ملت آدم کے خواب کی عملی تعبیر کی راہ عمل اختیار کریں اور اگر ہم نے یہ راہ نہ اپنائی تو علامہ اقبال نے

خبردار کیا ہے کہ:

اگر قبول کرے، دین مصطفیٰ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

علامہ اقبال کے تصور اسلام کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان کے کلام کی نورانی کیفیت اور ان کی تقاریر و مضامین کی دانش برہانی کو اپنے فکر و خیال میں جگہ دینا ہوگی تاکہ ہم نوع انسانی کی بقا کی جنگ میں کامرانی حاصل کرسکیں جس کا نسخہ علامہ اقبال نے اس شعر میں عطا کیا ہے:

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہوجا

اقبال کا تصور اسلام ہمیں آج کی موجودہ پاکستانی فضاؤں کی معرکہ آرائیوں میں بھی سحر آشنا کرتا ہے اور ہمیں انسانیت دوستی، محبت، یگانگت، الفت، عدم تشدد، بھائی چارہ، تحمل مزاجی اور پرامن زندگی گزارنے کی راہ دکھاتا ہے۔ اگر ہم اقبال کے تصور اسلام سے فیضاب نہیں ہوں گے تو اس کا انجام بھی مزید پریشانیوں اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہنے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

دل ہے مسلماں میرا نہ تیرا
تو بھی نمازی، میں بھی نمازی
میں جانتا ہوں انجام اس کا
جس معرکے میں ملاّ ہوں غازی

غالب کے چند پہلو

شمس الرحمٰن فاروقی

قیمت: ۱۰۰ روپے

کلامِ اقبال میں فکری وفنی ہم آہنگی

رابعہ سرفراز

کلام اقبال کی فکری پختگی اور فنی مہارت ایک اکائی کے دو پہلو ہیں۔ اقبال کے مشاہدات و تجربات خلوص کی شدت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک تخلیقی وحدت کی صورت میں اظہار پذیر ہوئے ہیں۔ اقبال کے فن میں جذبات کا سوز و گداز بھی ہے اور تعقل و تفکر کی گہرائی بھی۔ وہ مذہب، اخلاقیات اور فلسفہ کے ذریعے اپنی فنی صلاحیتوں کو جلا بخشتے ہیں۔

اقبال کا فن توازن اور تناسب کی عمدہ مثال ہے۔ ان کے اشعار اکہری اور سادہ کیفیت کی بجائے پہلودار انداز کے حامل ہیں اور اپنے قاری سے فکر و نظر کی بالیدگی کے متقاضی بھی۔ پرانی اقدار کے مٹتے آثار اور نئی قدروں کے استحکام کی کوششوں میں سرگرمِ عمل ہر صاحب دل کی طرح اقبال اپنے زمانے کے حقائق سے ہر لحہ باخبر اور آگاہ تھے۔ یہی آگاہی ان کی حساسیت اور اضطراب کا محرک تھی۔ اپنے دور کے تلخ حقائق کو اشعار کی صورت میں پیش کرنا اور ایسی شاعری کا ملبوس عطا کرنا جو قارئین کو اپنی طرف متوجہ کر سکے کوئی آسان کام نہ تھا لیکن اقبال نے زمانے کی کرختگی کو اپنے شیریں نغموں میں ایسے بیان کیا کہ ان نغموں کی گونج پورے برصغیر میں سنائی دینے لگی۔ اقبال ایک حقیقت پسند فن کار تھے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

> ''اقبال کے ذہن یا فن میں اگر ذرا بھی سقم یا نقص یا ضعف ہوتا تو وہ یا تو ولیم ٹیلر ئیٹس کی طرح رومان و تصوف میں گم ہو جاتے یا ٹی ایس ایلیٹ کی طرح تمدن کے جلتے ہوئے خرابے میں خود بھی جل کر راکھ ہو جاتے اور دوسرے درجے کی الجھی الجھی بجھی بجھی شاعری سے زیادہ کوئی چیز آج کی انسانیت کو دے نہیں پاتے لیکن اقبال کا ذہن نہایت ہی استوار اور فن نہایت مستحکم تھا چناں چہ انھوں نے جدید تہذیب و تمدن کے آتش کدے میں قدم رکھ کر اس کے سرکش ہی کو گل زار بنا دیا۔''(۱)

اقبال نے زندگی کے بدصورت پہلوؤں اور رویوں کی کجی کو اپنے فن سے ایک ایسی صورت عطا کی کہ مسائلِ حیات کی تلخی گوارا ہو سکے۔ اقبال نے فکر و فلسفہ کو کبھی شاعری کے لیے مسئلہ نہیں بننے دیا بلکہ اپنی تمام تخلیقی کاوشوں کے لیے ایک کڑا معیار مقرر کیا جس کے فطری نتیجے کے طور پر وہ فنی میدان میں مصروفِ عمل ہو گئے۔ ان کے شعور نے مواد و ہیئت کے درمیان توازن کو ایک تعمیری اور مثبت رُخ

پر قائم کیا۔

اقبال کی فکری وفنی ہم آہنگی ادب میں روایت اور انفرادیت کے باہمی ربط کا نتیجہ ہے۔ اقبال نے صحیح معنوں میں مکمل ذمے داری کے ساتھ آفاقی شاعری کی۔ اقبال کے بعض ناقدین نے ان کی شاعری کے فکروفن کو ایک دوسرے سے الگ کر کے پیش کیا ہے جب کہ اقبال کے کلام کے یہ دونوں اجزا اکائی کی صورت میں مربوط ہیں۔ اقبال کا فن ایک عظیم فکر کا آئینہ ہے اور فن کے اس آئینے میں فکر کا عکس بھرپور انداز میں جلوہ فگن ہے۔

اقبال ایک باخبر باشعور اور صاحبِ علم فن کار تھے۔ مشرقی ومغربی ادبیات اور تنقیدات سے واقفیت اور علوم وفنون کے تقاضوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اقبال کے فن کی تاثیر اور ذہن کی استقامت کا فطری نتیجہ وہ جوش و جذبہ ہے جو ان کی شاعری کے ذریعے قاری کے اندر حوصلہ اور ولولہ پیدا کرتا ہے:

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگین بیانوں میں
کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں میں
اثر یہ بھی ہے اک میرے جنونِ فتنہ ساماں کا
مرا آئینۂ دل ہے قضا کے راز دانوں میں(۲)

شاعرِ دل نواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری
شانِ خلیل ہوتی ہے اُس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شِعار آزری
اہلِ زمیں کو نسخۂ زندگی دوام ہے
خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخن وری
گلشنِ در میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو (۳)

تازگی، جدت، آزادی اور تخلیق اقبال کی پسندیدہ اصطلاحیں ہیں۔ اقبال کے اکثر ناقدین کے اس قسم کے بیانات کو بنیاد بناتے ہیں کہ وہ غزل کی زبان سے باخبر نہیں ہیں، شاعر کو سخن وری کا فن نہیں آتا وغیرہ۔ درحقیقت یہ ایک عظیم شاعر کا انکسار ہے۔ اقبال کی غزل کی عام روایت کے برعکس ایک تصور پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حدیثِ بادہ و مینا جام آتی نہیں کے معترف ہیں۔ اقبال مینا و جام کے شاعر نہیں بلکہ زندگی کے حقائق کے نغمہ خواں ہیں۔ تخلیق کا یہ کٹھن عمل عظیم فن کاری کے بغیر ممکن نہیں۔ اقبال کی شاعری رسوم و قیود کی پابندِ

محض نہیں ہے۔ ہیئت اور اسلوب کے حوالے سے شاعر کا تخیل اور عمل دونوں منفرد ہیں۔

تخلیقی آزادی شاعر کے مقصدِ تخلیق کی عطا ہے۔ اقبال کی شاعری شعر برائے شعر نہیں بلکہ صحیح معنوں میں زندگی کی تزئین ہے۔ فکر کی پختگی اور استقامت نے اقبال کو فن کے لیے یکسو کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے تصورات میں تنوع کے باوجود ہم آہنگی اور اسالیبِ بیان میں ہمواری و استواری ہے۔ اقبال ہیئت سخن کے سلسلے میں کسی کی نقالی کی بجائے اپنے مخصوص معیار سے کام لیتے ہیں۔ وہ مغربی تمثیل پر مشرقی تغزل کو فوقیت دیتے ہیں۔ بعض مقامات پر اپنی شاعری کے لیے ''غزل خوانی'' اور ''غزل سرائی'' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ کلامِ اقبال کا آہنگ اہمیت کا حامل ہے۔ اقبال کی شاعری دراصل ایک نغمہ ہے اس کا اولین اور دیرپا تاثر اس کی لے اور لحن پر مبنی ہوتا ہے۔ مشکل سے مشکل الفاظ اور تراکیب اقبال کی شاعری میں موسیقی کا تناسب و توازن اختیار کر لیتے ہیں:

یہ کون غزل خواں ہے پرسوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز (۴)

اقبال نے سوز و گداز کی عام شاعرانہ ترکیب کو نئی جہت عطا کی ہے اور سوز کے ساتھ نشاط کا لفظ جوڑا ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی نے اسے ایک غیر معمولی امر اور اجتہاد قرار دیا ہے۔

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں (۵)

اقبال کے تغزل کی آواز تمام آلائشوں سے پاک ہے اور خودی و خدا کے درمیان مکالمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال کے تغزل میں فطرت کا حسن و جمال اور مسائلِ حیات کا جلال ہم آہنگ ہو کر شاعری کی مختلف جہتوں کو نقطۂ کمال تک پہنچاتا ہے۔ اقبال کی نظم اور غزل اردو شاعری کا شاہکار ہے۔ دونوں میں اقبال کی شاعری کا انداز اور معیار یکساں ہے۔ ایک ہی اسلوب اور طرزِ بیان ہے جو غزل میں بھی نظم کی شان سے رونما ہوا ہے۔

اقبال کی اکثر نظموں میں غزل کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ اقبال کی شاعری محض بیان کی وسعت اور اخلاق کی اصلاح تک محدود نہیں ہے۔ وہ غزل کی تنگ نائے میں مکمل و موثر اظہار پر قادر ہیں اور نظم میں انھوں نے اخلاق کی اصلاح سے آگے بڑھ کر اقوام کی ذہن میں انقلاب کا ساماں پیدا کیا ہے۔ اقبال کا جذبہ اپنی وسعتوں، گہرائیوں اور بلندیوں کے سبب ان کی نظم و غزل دونوں میں یکساں طور پر موجود ہے۔ رنگ و آہنگ کی یکسانی کے باوجود ان کے اشعار میں تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ یکسانیت اور تنوع کی یہ متضاد کیفیات ایک انوکھے حسن کا باعث ہیں۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کی رائے میں:

> ''یہ ایک انسان کا کلام ہے مگر اس پر صحیفۂ آسمانی کا نور پرتو فگن ہے اور صحیفۂ آسمانی کی زبان متانت و شوکت کا معیار ہوتی ہے جس کی طرف پرواز اقبال کے طرزِ بیان کا امتیازی نشان ہے۔'' (۶)

اقبال جیسے منفرد فن کار سے روایتی اصناف، اسالیب، مضامین اور زبان کا تقاضا غلط ہوگا۔ ان کے کلام میں تغزل کی شان فوری

طور پر پیدا ہونے والی کیفیت ہے۔ ''بالِ جبریل'' اور ''ارمغانِ حجاز'' کی متعدد مسلسل غزلیں غیر معمولی تغزل کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ جابر علی سید لکھتے ہیں:

''اقبال کے تغزل کا عمومی معیار اور شناخت لطافت بیان، ایجاز، عمومیت اور نغمہ آفرینی ہے۔ ترنم ان کی غزل کا بنیادی جوہر ہے۔''(۷)

''بانگِ درا'' کی غزلیں اپنے تخلیق کار کی انفرادیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اگرچہ یہ غزلیں تعداد میں کم ہیں لیکن خیال کی رعنائی اور ندرتِ بیان کے باعث اہم ہیں۔ بعض ناقدین انھیں داغ کی روایت کی پیروی قرار دیتے ہیں لیکن ان غزلوں میں نکھار اور جدت موجود ہے۔ اکثر ردیفیں نئی اور دلفریب ہیں مثلاً کچھ بھی نہیں(۸) میں تھی(۹) کرتے ہیں(۱۰) کیا تھی(۱۱) کیوں کر ہوا(۱۲) کرے کوئی(۱۳) چاہتا ہوں(۱۴) ہوں میں(۱۵)

کلام میں موسیقیت گہری معنویت پیدا کرتی ہے۔ اقبال کی شاعری پہ معانی سے چھلکتی ہوئی نغمہ ریزی کا احساس ہوتا ہے۔ کلامِ اقبال کے شعری آہنگ میں وہی رنگارنگی ہے جو کائنات کے عناصر میں کارفرما ہے۔ یہ تنوع اپنی مثال آپ ہے اور تخلیق ہیئت کے لیے بھی اہم ہے۔ حروفِ علت کے نمونے اقبال کی معنویت میں اضافہ کرتے ہیں:

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن
برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن (۱۶)

ساقی نامہ، خضر راہ اور مسجد قرطبہ میں تصویر آفرینی پس منظر کا کام دیتی ہے۔ یہ پس منظر شاعر کے نفسیاتی ارتقا سے متعلق ہے جو حرکت اور تعمیر کی خواہش سے مکمل ہوتا ہے۔ اقبال کی نظمیں ان کے صوری، معنوی اور شعری ارتقا میں معاون ہیں۔

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہوسکا وہ تو کر (۱۷)

اقبال کی نظم اور فکر کے اعتبار سے ساکن ہے لیکن اقبال کے شاعرانہ تخیل نے اسے ایک دلکش حرکی پیرہن عطا کیا ہے۔

''بالِ جبریل'' کی ہر غزل تغزل میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اقبال کے آخری دور کی نظمیں بالخصوص تغزل کی کیفیت سے معمولی ہیں۔ وہ جب بھی فکر کی رفعت اور اظہار کی انفرادیت میں امتزاج پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، ان کی نظموں کے شعر غزل کے شعر معلوم ہوتے ہیں اور ان نظموں کی ساری فضا رنگِ تغزل میں ڈوب جاتی ہے۔ اقبال تشبیہوں کے انتخاب میں آزادی سے کام لیتے ہیں اور تشبیہ سے ایک ایسی فضا پیدا کرتے ہیں جو ذہن کو خود بخود اقبال کے پسندیدہ موضوع کی طرف مائل کرتی ہے۔ یہ تشبیہیں خوب صورت ہیں اور شاعر کے بیان نے اس حسن میں مزید نکھار پیدا کیا ہے:

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسنِ ازل کے ہے نمود، چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لیے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں
سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
کوہِ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں (۱۸)

دمادم رواں ہے یمِ زندگی
ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود
کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود
گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گِل
خوش آئی اسے محنتِ آب و گِل
یہ ثابت بھی ہے اور سیّار بھی
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی
یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں، بے نظیر
یہ عالم، یہ بت خانۂ شش جہات
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات
پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں (۱۹)

اقبال کے فکر کی یکسوئی اور تخیل کی بلندی نے اپنے لیے لطیف اور نکھرے ہوئے اسلوب پیدا کیے اور اپنے کلام کو فکر، تخیل اور اظہار کے متوازی امتزاج کا قابلِ رشک نمونہ بنایا۔ کسی مقام پر بھی شاعر کے ارادے، کوشش یا آورد کا دخل نظر نہیں آتا۔ ہر جگہ اقبال کی مستحکم شاعرانہ شخصیت کا پرتو ہے۔ ایڈورڈ میکارتھی نے لکھا ہے:

What was not realized by the west was the essential unity of Iqbal's poetic

vision for in this poet, thought and poetry were fused as these had very rarely been done before, and as such it is not possible to discuss the poetry without a knowledge of his thought. It is also difficult fo fully understand the thought an appreciation of the poetry as; both are complementary. In the ultimate analysis poetry, thought and action are all merged into one.(20)

اقبال ایک ایسے ذہین فن کار تھے جنھوں نے اپنی شاعری میں تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی اور کامیاب رہے۔ ان کی شاعرانہ نظر نے بہت سے خواب دیکھے جو ان کی خوبصورت شاعری کی بنیاد بنے۔ کلامِ اقبال کا آفاقی رنگ مظاہر و حقائق کی اصلیت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ان کے کلام میں فکر و فن کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

حواشی:

(۱) عبدالمغنی ڈاکٹر، اقبال کا نظامِ فن، لاہور: اقبال اکادمی، پاکستان، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲

(۲) اقبال، کلیات اقبال (اردو)، لاہور: اقبال اکادمی، پاکستان، ۱۹۹۴ء، ص ۹۹، (تصویرِ درد، بانگ درا)

(۳) کلیات اقبال (اردو)، ص ۲۴۰، (شاعر، بانگِ درا)

(۴) کلیاتِ اقبال، ص ۳۶۳، (بالِ جبریل)

(۵) کلیاتِ اقبال، ص ۳۶۴

(۶) اقبال کا نظامِ دن، ص ۷۵

(۷) جابر علی سید پروفیسر، اقبال۔ ایک مطالعہ، لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۸۵ء، ص ۱۱۲

(۸۔۱۵) کلیات اقبال (اردو)، ص ۱۶۱، ۱۶۵، ۱۲۴، ۱۲۶، ۱۲۸، ۱۳۱، ۱۳۲

(۱۶) کلیاتِ اقبال (اردو)، ص ۳۶۷

(۱۷) کلیات اقبال، ص ۳۸۷

(۱۸) کلیات اقبال، ص ۴۳۸، (ذوق و شوق)

(۱۹) کلیات اقبال، ص ۴۵۳، (ساقی نامہ)

(۲۰) Iqbal as a poet and philosopher (Edward Mc Carthy) Selections from the Iqbal Review, Dr. Waheed Qureshi, Iqbal Academy Pakistan, 1983, page280)

فکرِ اقبال کے ترقی پسندانہ زاویے

ڈاکٹر طاہر تونسوی

مجھے خبر ہے
یہ میرے وجدان نے کہا ہے
وہ علم کا بے کراں سمندر
وہ عقل و دانش کا اک شجر ہے
مجھے خبر ہے
وہ جس کی شاخوں نے فہم و ادراک کو بھی جوشِ جمال بخشا
اور چاندنی کے کنول اُگائے ہیں تیرگی میں
طلسم توڑا ہے ظلمتوں کا
نئی سحر کا شعور ابھرا کہ اس نے
ہر لفظ کے معانی بدل دیے ہیں
مجھے خبر ہے
وہ جس نے بانگِ درا کی صورت
خضرِ راہ کا پیام بخشا
وہ جس نے ضربِ کلیم دے کر خوابِ غفلت سے یوں جگایا
کہ ہم نے زنجیریں توڑ ڈالیں
مجھے خبر ہے
پیامِ مشرق سے جس نے سوزِ دروں کا ہم کو پتا بتایا

وہ ارمغانِ حجاز اس کا پیام بن کر جہاں میں آئی
پیام جس نے ہمارے ذہنوں میں فلسفے کے
رازِ پیچیدہ کھول ڈالے
مجھے خبر ہے
کہ پھر ہماری ہدایتوں کو
بالِ جبریل کا نشانِ عظیم بخشا
مجھے خبر ہے
کہ روحِ غالب بھٹک رہی تھی خلد کی بے پایاں وسعتوں میں
زمیں پر اُتری
تو اس نے اقبال نام پایا
مجھے خبر ہے
یہ میرے وجدان نے کہا ہے
وہ علم کا بے کراں سمندر ہے
وہ عقل و دانش کا ایک شجر ہے(۱)

(ڈاکٹر طاہر تونسوی)

حقیقت بھی یہی ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے تناظر میں جن خیالات و افکار کو منکشف کیا ہے اس کی تفہیم کے لیے اقبالیات کی اصطلاح وضع کی جا چکی ہے اور اس نے جن تصورات اور نظریات کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے اس کی وسعت ہمہ گیری اور آفاقیت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے کلامِ اقبال کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ حیاتِ انسانی اور اس سے پیدا شدہ کیفیات کا کون سا ایسا نکتہ اور زاویہ ہے جو اقبال کے ذہنِ رسا کی گرفت میں نہیں آتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ علامہ اقبال اس عہد کے مروجہ مشرقی اور مغربی دونوں علوم سے نہ صرف واقفیت رکھتے تھے بلکہ بعض پر انھیں مکمل عبور حاصل تھا اور اس پر اسلامی و قرآنی علوم پر قدرت مستزاد۔ علامہ اقبال کے کلام کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے باطن میں جو درد اور سوز مندی تھی وہی ان کے فکری نظام کی اساس بنی اور وہ بنی نوع انسان کی حالتِ زار دیکھ کر تڑپ اُٹھتے تھے اور اس طرح وہ کہہ اٹھے:

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

---

(۱) روحِ آدم کا مسیحا از ڈاکٹر طاہر تونسوی

شانِ خداوندی نہ لینے اور مقام بندگی نہ دینے کی جو کیفیت علامہ اقبال کے ہاں موجود دکھائی دیتی ہے اس کی بنا پر ایک اقبال شناس عبدالرحمٰن طارق نے لکھا ہے کہ اقبال ایک رقیق القلب ہمدردِ نوع انسانی ہونے کے لحاظ سے مظلوم اور نادار و بے کس لوگوں کا مخلص و بے ریا دوست ہے جب اس نے سرمایہ دار طبقے کے گوناگوں مظالم اور مزدور و مزارع کی غیر متناہی حق تلفیاں دیکھیں تو اس کے سازِ دل سے بے اختیار کچھ دردناک اور پرسوز نغمے اُٹھے جو اس نے منصفانہ نظر سے موزوں کر دیے اور پھر موجودہ اقتصادی معائب کو رفع کرنے کا ایک فطری اور قابلِ عمل دستور بھی ہمیں بتاتا چلا گیا۔(۲)

یوں دیکھیں تو علامہ اقبال نے استحصالی طبقوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی بلکہ پسے ہوئے مظلوم طبقوں کی حمایت بھی کی اور ان کے جذبات و احساسات کے ترجمان بھی بن گئے۔ اس تناظر میں ان کے کلام میں سرمایہ دار اور محنت کش، جاگیردار و دہقان و کسان، زمیندار اور مزارع اور آجر و اجیر کے درمیان ہونے والی کشمکش کا بھرپور انداز میں اظہار ملتا ہے اور یہ بات ان کے ترقی پسندانہ رویوں کی غماز بھی ہے اور عکاس بھی۔ کلیاتِ اقبال کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علامہ اقبال کے ہاں ان ترقی پسندانہ رویوں کی ابتدا بانگِ درا کی نظم خضرِ راہ کے عنوان سرمایہ و محنت سے ہوتی ہے اور پھر اس کا سلسلہ چل نکلتا ہے اور جوں جوں اقبال کا مطالعہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے توں توں ان رویوں اور زاویوں میں بھی تیزی اور تندی آتی جاتی ہے اور وہ ایک انقلابی شاعر کی شکل میں سامنے آتے ہیں اس حوالے سے ان کے کلام سے چند نمونے یہ ہیں۔

شانِ دہقان (بانگِ درا) لینن خدا کے حضور میں (بالِ جبریل) فرمانِ خدا (بالِ جبریل) الارض للہ (بالِ جبریل) ارض ملک خداست (جاوید نامہ) خطاب بہ ملت روسیہ (جاوید نامہ) صحبتِ رفتگاں در عالم بالا، ٹالسٹائی، کارل مارکس، ہیگل، مزدک، کوہکن (پیامِ مشرق) مردِ مزدور (پیامِ مشرق) قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور (پیامِ مشرق) ابلیس اپنے مشیروں سے (ارمغانِ حجاز) پنجاب کے دہقان سے (بالِ جبریل) اس طرح کی بہت سی نظمیں اور بہت سے متفرق اشعار علامہ اقبال کے ان رویوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن میں سماج کے دشمنوں کی مذمت بھی کی ہے اور ان کے عزائم کو بے نقاب بھی کیا گیا ہے اور ''اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے'' کا درس دیتے ہوئے انھیں ایسی منفی قوتوں کے خلاف آواز بلند کرنے کی جانب واضح اشارات کیے ہیں اس لیے کہ علامہ اقبال ان کے منفی رویوں سے نہ صرف نفرت کرتے ہیں بلکہ ان کے دل دردمند میں کراہیت بھی پیدا ہوتی ہے اور وہ شدید دکھ کا احساس کرتے ہوئے ان کے خلاف نبرد آزما ہونے اور عملی جہاد کرنے کی تلقین ہی نہیں تاکید بھی کرتے ہیں اور ان کی آرزو اور خواہش بھی یہی ہے کہ سرمایہ دار و جاگیردار کے ہتھکنڈوں کو نہ صرف ناکام بنایا جائے بلکہ انھیں پوری قوت اور توانائی سے جڑ سے بھی اکھاڑ کر پھینک دیا جائے تاکہ ان کا بیج پھر نہ پنپ سکے اور بقول خلیفہ عبدالحکیم، ''اقبال کی تمام شاعری اور اس کے افکار اور جذبات پر جو چیز طاری معلوم ہوتی ہے وہ تمنائے انقلاب ہے۔''(۳) میرے نزدیک یہاں صرف تمنائے انقلاب کی صورت نہیں بلکہ انقلابی عمل اور ایک پائیدار تبدیلی کی آرزو جلوہ گر نظر

---

(۲) جوہرِ اقبال از عبدالرحمٰن طارق، ص ۳۲۷

(۳) فکرِ اقبال از خلیفہ عبدالحکیم، ص ۱۷۱

آتی ہے اور وہ اس تمنا کو عملی شکل میں دیکھنے کے طلب گار ہیں چناں چہ جہاں وہ اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ:

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات
اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو
حکم حق ہے لیس للانسان اِلا ماسعیٰ
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دوم

فرمانِ خدا (فرشتوں سے) میں علامہ اقبال نے جو لب و لہجہ اختیار کیا ہے وہ ایک بھرپور انقلابی کا ہے اور یہ انقلابی رویہ ایک دن میں پیدا نہیں ہوا اور نہ ہی یہ اچانک بیدار ہوا ہے بلکہ اس کے پس منظر میں برس ہا برس کا مشاہدہ اور سوچ و فکر کا عمل کارفرما ہے اور جس کا اظہار جا بجا ان کے کلام میں ہوا ہے اور اس کے پیچھے وہ دردمندی اور کرب ہے جس کا تذکرہ پہلے ہوا ہے۔ علامہ اقبال جب مزدور و مزارع کی حالت دیکھتے ہیں تو ان کے معجز نما قلم سے یوں احتجاج بلند ہوتا ہے:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا
دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دو شالہ

اور پھر بانگِ درا کی نظم شانِ دہقان میں علامہ اقبال حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں:

بے خبر تو جوہرِ آئینہ ایام سے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اور پھر اسے اپنی تقدیر بدلنے کا درس دیتے ہیں اس میں عزم و ہمت اور حوصلہ پیدا کرتے ہیں اور اس میں جرأت پیدا کرنے کے لیے کہہ اٹھتے ہیں:

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

اس تناظر میں دیکھیں تو علامہ اقبال معاشرے کے بے کس طبقوں میں صدائے احتجاج بلند کرنے اور اپنے حقوق کو حاصل کرنے کی امنگ بیدار کر رہے ہیں۔ ستم رسیدہ قبیلے کے ان لوگوں کے لیے وہ ایک پیغام بر کی حیثیت سے برملا کہتے ہیں:

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب

سچ تو یہ ہے کہ علامہ اقبال کے اس پیغام میں عالمگیریت بھی ہے اور آفاقیت بھی جو ان کی شاعری کو محدود سے لامحدود کر دیتی ہے اسی لحاظ سے وہ اپنے ترقی پسندانہ رویوں اور کلام کے زاویوں سے مظلوم طبقے کے سب سے بڑے داعی نظر آتے ہیں۔

نوادرِ ظفر
ترتیب و مقدمہ
از
ڈاکٹر شان الحق حقی
صفحات: ۳۵۲ قیمت: ۲۰۰ روپے
انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

اقبال پھر اقبال ہے

کیفی حسینی

اردو شاعری قلی قطب شاہ سے داغ دہلوی تک آتے آتے ہزار عشوہ طرازی وصد ہزار رنگ سامانی کے ساتھ گزری ہے۔ فارسی غزل کے تتبع میں میر سے داغ تک بغور مطالعہ کر جایئے سوائے معشوق سے گفتگو محبوب کے لب و رخسار، ہجر و وصال، شب غم کے افسانوں کے علاوہ غزل میں اور کوئی دوسرا مضمون نہیں ملتا۔ حالاں کہ ''اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا'' البتہ اردو غزل کی یہ خوش نصیبی کہ اسی زمانے میں ایک ایسا شاعر بھی ادب عالیہ نے دریافت کیا جسے ہم پوری دیانت کے ساتھ عوامی شاعر کہہ سکتے ہیں۔ حالاں کہ اس غریب کو اس کے ہم عصروں نے شاعر ماننے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ بہرحال اس نے اپنی مٹی سے وفا کی اور ہندوستانی معاشرت، تہذیب وتمدن یہاں کے موسم عوامی میلے ٹھیلے الغرض اس نے اپنی مٹی سے ہی اپنی فکر وفن کو سنوارا وہ ہے نظیر اکبر آبادی جو قرار واقعی عوامی شاعر کہلانے کا مستحق تھا۔

زمانے کی بوالعجبی دیکھیے کہ اسی دور میں غالب جیسا شاعر پیدا ہو جو اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گیا تھا۔ جس کی انا کسی کو بھی خاطر میں نہ لائی تھی۔ جو اپنے ہم عصروں کی تعریف بھی اپنے منفرد انداز میں کرتا ہے کہتا ہے کہ:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

یا خدائے سخن حضرت میر کے اعتراف کے موقع پر بھی اپنے دامن کو سمیٹ کر اعتراف کرتا ہے:

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

بہرحال جس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اردو شاعری کو فلسفہ سے روشناس کرایا جب کہ غالب سے پہلے اردو شاعری فلسفہ سے ناآشنا تھی۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد مسلمانوں کی پستی و زبوں حالی کو دیکھ کر سرسید نے علی گڑھ تحریک کی بنیاد رکھی۔ اگر سرسید یہ قدم نہ

اٹھاتے تو مسلمانوں کو ذلت کے غار میں دھکیل دیا جاتا اس لیے کہ مسلمان وہاں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے اور پھر کئی سو سال تک حکمران رہے۔

سید صاحب کی تحریک کے رفقا میں حالی اور محمد حسین آزاد نے پنجاب بک ڈپو کے زمانے میں انجمن پنجاب کے تحت شاعری میں ایک نئی تحریک شروع کی۔ مختلف عنوانات کے تحت نظم کے ارتقا کا جس نے بڑی حد تک غزل کے روایتی مضامین کی بجائے مختلف عنوانات پر نظمیں لکھیں اور یہ سلسلہ بڑا کامیاب رہا۔ جو ایک طرح سے ایک مدت تک زبان و شاعری میں نئی کروٹ لینے کا سبب بنا۔

بالآخر سرسید تحریک کے نتیجے کے طور پر نوجوان مغربی تقلید کو مغربی حیات سمجھنے لگے تھے اور اپنا مسلمان ہونا ان کے نزدیک باعث فخر ہونے کی بجائے معذرت خواہاں ہوتا جا رہا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اس تحریک کے سبب کسی حد تک معاشی پستی سے نکلنے میں مسلمان کامیاب ضرور ہوئے تھے لیکن ان کا رخ اپنی منزل کی صحیح سمت کے بجائے مخالف رُخ پر تھا۔ ایسے نازک مرحلے پر مولانا حالی نے اصلاح قوم کا بیڑا اٹھایا اور حتی المقدور نظم و نثر کے ذریعے قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔

ادبی بددیانتی کے ساتھ ساتھ ناانصافی بھی ہوگی اگر ہم اکبر کی خدمات کو بھول جائیں۔ اکبر اگرچہ سرسید سے خوش تھے لیکن تحریک کے بعض پہلوؤں سے ناراض۔ اکبر قوم کو مغربیت، اور اس کی تہذیب و تمدن سے بچانے کے لیے بے چین ہوگئے اور ملت کی خاطر میدانِ عمل میں کود پڑے اور اپنے لیے وہ پیرایۂ اظہار اختیار کیا جو اردو شاعری میں میر سے اکبر تک کہیں نظر نہیں آتا۔

اکبر نے اس معرکۂ جہاد کے لیے طنز و مزاح کے ہتھیار استعمال کیے گویا قوم کو کونین اور سخت کڑوی کونین تو دی لیکن مزاح و طنز کی مٹھاس میں لپٹ کر اور روزِ اول سے لے کر عمر کے آخری حصے تک وہ اپنے فرض سے کبھی غافل نہ ہوئے۔ پھر بھی غالب کا فلسفہ، حالی کی مناجات اور اکبر کی ظرافت کی قوم نے وہ پذیرائی نہیں کی جس کی وہ مستحق تھیں۔

نہ حالی کی مناجاتوں کی پروا کی زمانے نے
نہ اکبر کی ظرافت سے رکے یارانِ خود آرا

بقول پروفیسر عنایت علی خاں سوال یہ ہے کہ آخر یارانِ خودآرا پر حالی کی مناجاتوں اور اکبر کی ظریفانہ نشتر زنی کا اثر کیوں نہیں ہوا؟ سرسید کو مطلوبہ مادی ترقی اور اکبر کی مطلوبہ دینداری میں سے کوئی ایک چیز تو مل جاتی، خدا نہ سہی وصالِ صنم ہی سہی۔ امیر خسروؒ کے دو سخنے کی زبان میں ہندوستانی مسلمانوں نے مغربی فکر کے تحت مادی ترقی کیوں نہ کی اور اکبر کی تلقین کے مطابق وہ اپنی تہذیبی اقدار کی حفاظت کیوں نہ کر سکے۔ اس دو سخنے کا ایک ہی حجاب ہے اور وہ جواب ہے غلامی۔

قدرت جس سے جو کام لینا چاہتی ہے لیتی ہے۔ یہ تمام روز ازل کے فیصلے ہیں کہ جس کو جس کام کے لیے منتخب کیا گیا وہ اپنے اپنے وقت پر دنیا میں آتا ہے اور اپنے حصے کا کام کر جاتا ہے۔ اردو ادب بھی ایسی بیسیوں مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ آپ کو معلوم ہے حضرت شبلی نعمانیؒ مصنف سیرت نبوی صلعم نسلاً راجپوت تھے آپ کے اجداد میں کسی نے اسلام قبول کیا تھا۔ اب آیئے ذرا دل و دماغ کو یکجا کر کے شاعر مشرق، حکیم الامت جیسے القابات سے جسے قوم نے نوازا تھا وہ خود کشمیری پنڈتوں یعنی کشمیری برہمن زادے تھے۔ جن

جن کے دادا مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ اس پر کسی اور کی نہیں اقبال کی گواہی کافی ہے۔ حضرت اقبال فرماتے ہیں:

مرا بنگر در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریزی ست

تنم گلے زخیابانِ جنت کشمیر
واں از حریم حجاز و نواز شیراز ست

اس اعتراف حقیقی کے بعد کیا بات تشنہ رہ جاتی ہے۔ قدرت کو اس برہمن زادے سے اصلاحِ امتِ محمدیہ کا کام لینا منظور تھا جسے اس نے روز ازل منتخب قرار دیا تھا۔

بہرحال شعرائے اردو میں حالی و اکبر کے بعد اقبال ہی وہ واحد شاعر ہے جس نے ملت کی زبوں حالی سے متاثر ہو کر ذلت کے گڑھے سے اور مغربی افکار و تہذیب، اور سرمایہ دارانہ حیلوں، اور مغربی لادینی فلسفے کے معاشرتی ردعمل سے نکالنے میں اپنی عمر عزیز گزار دی۔

اقبال نے مسلمانوں کو مغربی فکر کے غلبے سے بچانے کے بجائے جارحانہ طرز عمل اختیار کیا اور قدرت نے اقبال کی فکری تربیت کے لیے ایسے مواقع بھی فراہم کر دیے تھے کہ جس کے سبب اقبال نے مغرب اور مغربی افکار کو یورپ کے دورانِ قیام پورے شعور و قلب کی نگاہوں سے دیکھا، جانچا، پرکھا اور ہندوستان واپسی کے بعد مغربی، تہذیب و تمدن و افکار کو ہدفِ تنقید بنا کر مسلمانوں کو ان عوامل کی نشاندہی فرمائی جو بظاہر بہت عظیم الشان نظر آتی تھی۔ خود فرماتے ہیں:

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی
دیا ہے میں نے انھیں ذوقِ آتش شامی

جی ہاں یہ وہ اقبال کہہ رہے ہیں جو برملا خود اپنے تعلق سے یہ فرماتے ہیں کہ:

مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

یا

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

حضرت مان لیجیے! حضرت اقبال کی اس بات کو کہ واقعی وہ بھی اقبال سے آگاہ نہیں تھے۔ مگر ٹھہریے آپ پریشان ہوں؟ کس اقبال سے؟ شاعر مشرق سے، علامہ اقبال سے یا فلسفی اقبال سے ان سے تو وہ بخوبی واقف تھے بلکہ ہر روز ہم کلام بھی ہوتے تھے۔ تو پھر

سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس اقبال سے واقف نہیں تھے۔ جی ہاں وہ اس اقبال سے بالکل ناواقف تھے جو قدرت کی طرف سے الہامی علم، ندرتِ فکر، احساس وتڑپ کی دولت اپنے خمیر میں لے آئے تھے۔ قدرت کی ان نعمتوں سے وہ بالکل ناواقف تھے اور انھیں خبر تک نہ تھی کہ وہ اپنے خمیر میں کیا چیز رکھتے ہیں۔

تو عیار کم عیاراں تو قرار بے قراراں
تو دوائے دل نگاراں مگر ایں کہ دیریابی

غمِ عشق و لذتِ او اثر دو گونہ دارد
گہے سوز و درد مندی گہے مستی و خرابی

فقہی اصطلاح میں مجدد تجدید کرنے والا اور پرانے کو نیا کرنے والے کو کہتے ہیں دین میں جو بدعتیں شامل ہو جاتی ہیں ان کا قلع قمع کر کے دین کو پھر سے تازہ کر دیتا ہے۔ جیسے برصغیر میں کہتے ہیں حضرت مجدد الف ثانیؒ۔ اللہ رب العزت کی یہ سنت مبارک ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضور اکرم صلعم کی بعثت تک اگر آپ غور وفکر کریں، دیکھیں، محسوس کریں اور قرآن کریم کے انداز بیاں و تخاطب کو سمجھیں اور اس کے اشاروں کو دل و دماغ کی حسیات کے ساتھ محسوس کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ پروردگار عالم نے اپنی تخلیق کی نشوونما کا ہر طرف لحاظ و پاس رکھا ہے۔ اور پھر تخلیق بھی کون سی جو کائنات میں احسن الخلائق ہو بھلا وہ کیسے نامکمل رہتی اور وہ اس سے کیسے غافل رہتا۔ یہ دیکھنے میں اگرچہ ''کن فیکون'' کا ہی کھیل ہے، مگر جناب بازیچۂ طفلاں نہیں۔ خاص مقصد اور خاص ترکیب سے کھیلا گیا ہے اور اس کی مشیت جیسا چاہتی ہے عمل کرتی ہے۔ اور اس عمل کے فیصلے روز اوّل ہی ہو چکے تھے۔

''زندگی اور موت'' کوئی پیچیدہ یا پوشیدہ فلسفہ نہیں۔ ہاں زندگی اور موت کا جو درمیانی عرصہ ہے جسے ہم عرصۂ حیات کہتے ہیں وہ البتہ قابل غور ضرور ہے۔ کہ مشیت نے ذریات آدم کی تمام تر ذہنی وجسمانی نشوونما ارتقا کو بالکل آزاد رکھا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نسل آدم کی طرف سے غافل رہا۔ ایسا نہیں جوں جوں نسل آدم بڑھتی گئی اور اس کا شعور پختہ ہوتا گیا۔ اور وہ نئی نئی ضرورتوں کا محتاج ہوتا گیا اسی طرح اس کی تہذیب وتربیت کے لیے اپنے پیغمبر بھیجتا رہا۔

بلکہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا اور اس زمانے کے لحاظ اور اس کی ضرورتوں کے مطابق ویسے ہی انسان پیدا فرمائے جنھوں نے اس زمانے کی ضرورتوں کو اپنے علم، دانش، فکر وعمل سے سنوارا۔ آپ نے غور فرمایا کہ ایک وقت ایسے انسان (شداد ونمرود) پیدا فرمائے جنھوں نے خود خدائی کا دعویٰ کیا تو دوسری طرف ایسے بندوں سے اس کائنات کو رونق بخشی جنھوں نے انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کیا۔ میری مراد حضرت ابراہیم خلیل اللہ وحضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ اور ان کی ذریات میں سے ہے اور آج بھی یہ ارتقائی عمل جاری وساری ہے سوائے اس کے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم فرما دیا۔

بہر حال ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا بات پہنچی تری جوانی تک، کہ بات چل رہی تھی حضرت اقبال کی۔ اس مختصر مضمون میں اقبال

کی شاعری کے تمام پہلوؤں پر گفتگو کرنا بہت مشکل ہے اور پھر اقبال جیسی ہمہ صفت شخصیت پر مجھ جیسا طالب علم کا کچھ کہنا گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ میں صرف یہاں ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کے حوالے سے اقبال کے اس احسان کا ذکر کرنا چاہوں گا جو انھوں نے اردو زبان وادب پر کیا ہے۔

بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب اقبال کے نزدیک آرٹسٹ کا مقصد زندگی کی خدمت ہے۔ اس نے شعر کے ذریعہ زندگی کی صحیح ترجمانی کی ہے اور حرکی عناصر کو خاص طور پر اُجاگر کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے اور یہ دعویٰ سے کہی جاسکتی ہے کہ اقبال نے اپنے کلام میں زندگی کی نسبت جس قدر تشبیہیں، استعارے اور ترکیبیں استعمال کی ہیں، ان کی مثال فارسی اور اردو کے کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہیں ملتی۔ ہم ذیل میں بطور مثال ان ترکیبوں کو لکھتے ہیں۔ جن کی ندرت اور طرفگی سے فارسی اور اردو ادب کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ زندگی کے موضوع کو فارسی اور اردو میں سب سے پہلے اقبال نے پیش کیا۔

<u>ترکیبوں کی جدت</u>

شراب زندگی، حباب زندگی، سرود و بربط، زرم گاہِ خیر و شر، آرزوے ناصبور، شورش بزم طرب، سلسلہ ہستی، ذوق جدت، ذوق نمود، دفتر ہستی، خانم ہستی، آئینہ دار ہستی، ذوق آگہی، مستِ شراب تقدیر، لذت گیر وجود، سرمست مئے نمود، بربطِ گون ومکاں محشرستانِ نوا، منت کش ہنگامہ، مذاقِ رم، تابِ دوام، لطفِ خرام کوشش ناتمام، محفل ہستی، عم کدۂ نمود، ذوقِ تپش، شرار زندگی، فریب خوردہ منزل، کوکب تقدیر، طائر لاہوتی، نشاطِ رمیل، شہدِ ذوق وفا، خم زندگی، صنم خانۂ پندار، گرویدۂ بیدار، خلشِ کرشمہ، فیض شعور زندگانی، سوز مشتاق، شاخِ یقین، ولایتِ عشق، قامت خرد، قندیل دل، عفتِ فکر، چراغ ہوش، لذتِ امروز، ذوق فردا، تب وتاب جاودانہ، لذتِ ایجاد وغیرہ وغیرہ۔(۱)

اقبال کے کلام کے اس پہلو کے بعد ہم چاہیں گے کہ آپ کے علم میں اقبال کی وہ ندرت بھی سامنے آجائے جو اقبال سے پہلے اردو شاعری جس سے قطعاً ناآشنا تھی۔ مثلاً شاہین یا خودی کا کوئی تصور نہیں ملتا جس کو اقبال نے سب سے پہلے اردو شاعری کے ذریعہ روشناس کیا۔ دراصل اقبال کا فلسفہ خودی، اسلامی وقرآنی تعلیمات کی روح ہے اور اس کے عناصر ترکیبی میں اطاعت، ضبطِ نفس ونیابت الٰہی ہے وہ حرکت وعمل اور جدوجہد کے نقیب ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی نام ہے تجلیاتِ کلیم ومشاہداتِ حکیم کا۔ اس کی مثال میں بہت کچھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ مگر مضمون کی تنگ دامانی شاکی ہے، اس لیے ہم چند ہی مثالیں پیش کرسکیں گے۔ رہا ان کی تشریح ومعانی کی گہرائی وگیرائی کو ناپنا، یہ آپ کا کام ہے کہ اقبال نے خودی کے مفہوم کو کن کن انداز میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں کہتے ہیں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات

---

(۱) اس مختصر مضمون میں تمام ترکیبوں کا احاطہ ناممکن تھا اس لیے مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جنھیں ذوق ہے وہ 'روح اقبال' از ڈاکٹر یوسف حسین کا مطالعہ کریں۔

خودی جلوۂ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کی تل میں ہے

اس خودی کے پیرایۂ میں اقبال نے ملت کو نہ صرف بیدار کیا اور فکر کے ایسے ایسے اسلوب عطا کیے جو اقبال سے پہلے اردو شاعری میں عُنقا تھے۔ اردو ادب پر اقبال کا یہ بھی ایک احسان عظیم ہے کہ انھوں نے نئی نئی ترکیبوں کے ساتھ اردو کے دامن کو حقیقتِ ادراک سے مالا مال کیا۔

شاہین ایک ایسا استعارہ یا ایک ایسی علامت ہے جو اقبال سے پہلے اردو شاعری جس سے بالکل ناآشنا تھی۔ لیکن اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ اُسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ایک جگہ چیونٹی اور عقاب کے عنوان سے دو شعر لکھے ہیں جن میں انسانی سیرت کے رازوں کو تمثیلی انداز میں ظاہر کیا ہے، چیونٹی عقاب سے پوچھتی ہے:

میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند

اس کا جواب عقاب ان لفظوں میں دیتا ہے:

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاک راہ میں
میں نہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

بہرحال اتنی مثالیں موجود ہیں کہ ان کا بیان کرنا بھی مشکل ہے۔ البتہ اس کی نسبت اقبال نے کہا ہے کہ شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

۱۔ خوددار و غیرت مند ہے کہ اوروں کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔

۲۔ بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔

۳۔ بلند پرواز ہے۔
۴۔ خلوت نشین ہے۔
۵۔ تیز نگاہ (مکاتیب اقبال، ص ۲۰۲)

شاہین کے تعلق سے دو چار شعر ناظرین کی نذر:

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کی گنبد پر
تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں
گرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

جوانوں کو میری آہ کردے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نورِ بصیرت عام کردے

بہرحال

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہوچکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

کہ

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

—

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار — تدریس و تحقیق کا امتزاج

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

استادِ محترم پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار مرحوم (م: ۱۳؍جون ۲۰۰۷ء) بٹالہ کے رہنے والے تھے۔ خاندان کی گزر بسر تھوڑی بہت زمینوں پر ہوتی تھی۔ چھوٹے کسان کی طرح یہ ایک مشقت بھری زندگی تھی۔ بچے بھی والد کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ انھوں نے اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ اس طرح بیان کیا ہے:

ایک دفعہ رمضان المبارک میں ہمارے والد صاحب نے باغ میں سنگترے کے زائدالمیعاد درخت، جو ثمر آور نہیں ہو رہے تھے، کٹوا دیے۔ اس ایندھن کی لکڑیاں صبح سے شام تک بغیر کسی وقفے کے باغ سے گھر تک مجھے ڈھونی پڑیں۔ یہ فاصلہ کوئی ایک کلومیٹر سے زائد ہوگا۔ والد صاحب ہم سے مشقت لینے میں کوئی رعایت نہیں کرتے تھے۔ اور اس روز تو روزے کے ساتھ مجھ سے اتنی مشقت لی گئی اور بعض دفعہ ناقابل برداشت حد تک بوجھ اٹھوایا گیا۔ کہ میں اندر سے بلبلا اُٹھا، لیکن کوئی احتجاج تو ایک طرف رہا، زبان سے اُف تک بھی نہ کی۔ صبر و ضبط کا یہ سبق شاید ہماری تربیت کا حصہ تھا۔ اس روز بوجھ اُٹھا کر میں اتنا پیدل چلا کہ آج میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کچھ سردی کی وجہ سے اور کچھ بے پناہ تھکن کی باعث روزہ افطار کرتے ہی مجھے شدید بخار نے آدبوچا، اور میں بے سدھ ہو کر بستر میں دبک گیا۔ نہ کسی کو کچھ بتایا اور نہ ہی کھانا کھا سکا۔ اس حالت میں والدہ صاحبہ نے آ کر مجھے دیکھا تو میرا جسم پھنک رہا تھا۔ والدہ گرم گرم دودھ کا پیالہ لے آئیں اور بڑے اصرار سے پلایا تو پسینہ آ کر بخار قدرے کم ہوا۔ بمشکل اُٹھ کر عشا کی نماز پڑھی۔ مجھے کہا گیا کہ تم اگلے دن روزہ نہ رکھو، مگر میں اس قربانی کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکا۔ سحری کے وقت بخار اتر چکا تھا طبیعت بشاش تھی۔ روزہ رکھا اور پھر اگلے دن حسبِ معمول باغ سے ایندھن لانے کے پہنچ گیا۔ البتہ اس روز والدہ نے ہدایت کر دی تھی کہ زیادہ وزنی بوجھ نہ اٹھوایا جائے۔

(جگرِ لخت لخت، ص ۳۴۔۳۵)

یہ واقعہ مرحوم کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ایک کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محنت و مشقت اور سخت کوشی ان کی شخصیت کے تشکیلی عناصر میں ایک نمایاں اور بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ گھریلو اور خاندانی ماحول کی وجہ سے بچپن ہی سے ان کی تربیت، اس انداز میں ہوتی گئی کہ وہ کسی مشکل سے مشکل کام کو انجام دینے سے کبھی نہیں گھبرائے اور معمولی سے معمولی کام کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کی۔

والدہ بچپن ہی میں داغِ مفارقت دے گئیں۔ والد قدرے سخت گیر اور من موجی قسم کے انسان تھے۔ بچے ان کی خاطر خواہ توجہ سے محروم رہتے۔ بسا اوقات وہ لمبے عرصے تک کاروباری سلسلے میں بٹالہ سے باہر رہتے۔ غلام حسین نے لڑکپن اور اوائلِ جوانی کے کئی برس ناسازگار حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے گزارے۔ کہتے ہیں کہ بڑے بھائی کا رویہ بھی پریشان کن اور تکلیف دہ تھا۔ فقط چھوٹی بہن، فاطمہ ان کی ہم درد، دم ساز اور ہم راز تھی۔ اس نے کم سنی میں گھریلو ذمے داریوں کا بوجھ سنبھال لیا، مگر جب غلام حسین میٹرک کر کے ریلوے کی ملازمت میں آئے تو فاطمہ بھی چل بسی۔ لکھتے ہیں:

''ایک خزاں رسیدہ پتے کی طرح حوادث کے تھپیڑے مجھے اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر اڑا رہے تھے... بس میری حیثیت ایک تنکے کی سی تھی، جو سیلابِ بلا کی ساتھ بہہ رہا تھا۔'' (ص ۱۰۵)

میٹرک کے بعد ایم اے او کالج امرتسر میں داخل ہوئے مگر ناسازگار حالات کی وجہ سے سلسلۂ تعلیم منقطع کرنا پڑا۔ اس زمانے میں انھوں نے ریلوے کی ملازمت اختیار کی، اس ملازمت میں بدعنوانی اور زر و مال جمع کرنے کے مواقع بھی میسر آئے گھریلو تربیت اور طبعِ سلیم کی وجہ سے برائیوں کی دلدل میں پھنسنے سے بچے رہے۔ کہتے ہیں: 'کردار کی یہی خوبی میرا سب سے بڑا سہارا تھی۔'' (ص ۱۰۶) اور پھر قیامِ پاکستان کی تحریک میں بڑے جوش و خروش سے اور بڑے سرفروشانہ انداز میں حصہ لیا، ایک ہفتہ وار قلمی پرچہ ''المجاہد'' بھی جاری کیا۔ بعدازاں مسلم نیشنل گارڈز سے عملاً وابستہ رہے۔

اُن کی سخت کوش زندگی اور اسلوبِ حیات میں مسلم نیشنل گارڈز کی وابستگی اور ۱۹۴۵ء کے تربیتی کیمپ منعقدہ لاہور کی شرکت کا بھی دخل ہے۔ جس میں انھوں نے قدیم فنونِ سپہ گری، نیزہ بازی، پینترا، لٹھ بازی، اور بنوٹ وغیرہ کے ساتھ بعض جدید فنون کی باقاعدہ تربیت حاصل کی۔ میجر خورشید انور نیشنل گارڈز کے سالار تھے۔

قیام پاکستان کے بعد انھوں نے منقطع سلسلۂ تعلیم کو پھر سے جوڑا۔ اورینٹل کالج سے عالم، فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ یہیں سے ڈاکٹر سید عبداللہ سے ان کے سلسلۂ تلمذ کا آغاز ہوا جو اس وقت کے کالج کے پرنسپل اور صدرِ شعبہ اردو تھے۔ ایم اے اردو کے پہلے ہی سیشن (۱۹۵۳ـ۱۹۵۵ء) میں ایم اے کر لینے کے بعد انھوں نے تلاشِ روزگار اور روپیہ کمانے کے بجائے پی ایچ ڈی کرنے کی ٹھانی۔ شاید ان کے ذہن میں بچپن کا وہ منظر تازہ تھا جب پرائمری کے بعد والد نے تجویز کیا کہ غلام حسین کو بٹالہ کی کسی فیکٹری میں خرادیے کے کام پر لگا دیا جائے، اس طرح کچھ یافت ہو جائے گی اور گھر کی مالی حالت (جو خاصی ابتر ہو چکی تھی) اسے بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔ مگر ان کی والدہ اس تجویز کے سخت مخالف تھیں۔ اور کہہ رہی تھیں کہ میرا بچہ پڑھے گا اور ضرور پڑھے گا خواہ اس کے لیے خود

مجھے مزدوری کیوں نہ کرنی پڑے۔ پھر والدہ نے گھریلو خرچ سے پس انداز کی ہوئی کچھ رقم غلام حسین کو دیتے ہوئے کہا: ''جاؤ بیٹا! اسکول جا کر فیس داخلہ جمع کرا آؤ اور واپسی پر کتابیں بھی خرید لانا۔''

ڈاکٹر غلام حسین لکھتے ہیں، ''چند روپے ان کے گھریلو خرچ کا آخری اندوختہ تھے۔، میں نے ان کے چہرے پر نظر ڈالی، ان کے چہرے پر عزم کی تمازت تھی اور آنکھوں میں نمی تھی۔ یہ ان کے ضبط کا عالم تھا۔ میں یہ رقم لے کر اسکول چلا گیا اور اس قیمتی متاع اور انمول احساس نے مجھے زندگی کی ایک نئی راہ پر ڈال دیا۔'' (ص ۳۸) بہرحال اورینٹل کالج سے ایم اے اردو کر لینے کے بعد انھوں نے کوئی اور پیشہ اختیار کرنے کے بجائے اسی راستے پر آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ ان جیسے محنت کے عادی اور ہر دم متحرک رہنے والے شخص کے لیے پی ایچ ڈی کا معرکہ سر کرنا مشکل نہ تھا۔ خوش قسمتی سے انھیں یونی ورسٹی کی طرف سے وظیفہ بھی مل گیا۔ پھر کچھ عرصے بعد جب انھوں نے مقالہ مکمل کر لیا تو ۱۹۵۹ء میں ان کا تقرر بطور لیکچرر اورینٹل کالج میں ہو گیا۔ ۱۹۶۰ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی مل گئی۔ ۱۹۶۰ء سے وفات (۲۰۰۷ء) تک تقریباً نصف صدی کا سفر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی اولوالعزم شخصیت کی زندگی کا ایک تابناک باب ہے۔ اپنے ہدف (تدریس + تحقیق و تصنیف) کے حصول کے لیے نہایت باقاعدگی اور محنت، حد درجہ احساس ذمے داری اور ایک غیر معمولی دلی لگن اور جذبے کے ساتھ کام کیے چلے جانا ہمیشہ اُن کا شعار رہا۔ قائداعظم کا یہ قول ان کے پیش نظر رہا ہوگا: ''کام، کام اور کام'' یونی ورسٹی میں اگلے درجے میں ترقی کے لیے تدریسی تجربے کے ساتھ، تحقیق و تصنیف کی شرط بھی عائد کی جاتی ہے۔ تحقیق و تصنیف کا شعور رکھنے والے اساتذہ تو کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں اور ان کے لیے شرط کو پورا کرنا مشکل نہیں ہوتا، تاہم باقی اساتذہ بھی اس شرط کو پورا کر ہی لیتے ہیں، مثلاً کوئی نیا مقالہ لکھ نہیں پاتے تو اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے اجزا اِدھر اُدھر چھپوا کر یا چند کتابوں پر مضمون نما تبصرے جوڑ کر ''ریسرچ پیپر'' کی شرط پوری کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر غلام حسین صاحب، ان معدودے چند اساتذہ میں سے تھے جنھوں نے تدریس و تحقیق یعنی دونوں پلڑوں میں توازن کا خیال رکھا۔ خودنوشت میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''یونی ورسٹی میں تدریس کے بنیادی فرائض تن دہی سے انجام دینے کے علاوہ، میرا دل چسپ مشغلہ تحقیق و تصنیف رہا۔ مطالعہ و تحقیق درحقیقت تدریس کی ہی بنیاد استوار کرتا ہے اور فرض شناس استاد کو ان دونوں باتوں (تدریس اور تحقیق) کو ساتھ ساتھ لے کر چلنا چاہیے۔ مطالعہ و تحقیق، وژن (Vision) میں وسعت پیدا کرتے ہیں اور اسی سے تدریس میں بھی جان آتی ہے۔ یونی ورسٹی میں آنے سے قبل مجھے اسی مرحلے سے دوچار ہونا پڑا تھا، اور تحقیق و تصنیف کا سلسلہ ذوق و شوق کی حد تک میری زندگی کا حصہ بن گیا تھا۔'' (ص ۳۰۴)

جن لوگوں نے ڈاکٹر غلام حسین کو قریب سے دیکھا، وہ ان کے اس دعوے کی سو فیصد تائید کریں گے۔

خوش قسمتی سے راقم کو اورینٹل کالج کے زمانۂ متعلمی (۱۹۶۵ء۔۱۹۶۶ء) میں ان سے ایم اے اردو کا درس لینے کا موقع ملا۔ وہ

نہایت باقاعدگی کے ساتھ کلاس لیتے اور جو کچھ پڑھانا ہوتا اس کو پوری تیاری کر کے اور نوٹس بنا کے لاتے۔ وہ ہمیشہ روسٹرم پر کھڑے ہو کر درس دیتے تھے، سب سے پہلے رجسٹر پر حاضری لگاتے، پھر زیر بحث موضوع پر وہیں سے لیکچر کا آغاز کرتے، جہاں گزشتہ روز سلسلہ منقطع ہوا تھا۔ لیکچر کے دوران ان کی نظر بالعموم اپنے نوٹس پر ہی ٹکی رہتی اور شاگردوں پر نگاہِ غلط انداز بس کبھی کبھی ہی ڈالتے تھے۔ ان کی گفتگو نہایت سنجیدہ، مرتب اور اندازِ خطاب باوقار ہوتا۔ ٹھہر ٹھہر کو بولتے کہ طلبہ کو نوٹس لینے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ لیکچر اس قدر ہموار ہوتا کہ بعض اوقات نظم و نثر کی سرحدوں میں امتیاز مشکل ہو جاتا تھا، تاہم ان کا لیکچر اس قدر بھرپور ہوتا کہ متعلقہ موضوع پر کسی طرح کی تشنگی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ میرے ہم جماعت ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کے بقول: یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی ریڈیو پر تقریر کر رہا ہو۔

محنت، دیانت داری اور باقاعدگی و مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض (تدریس + تحقیق) انجام دینے کی عادت نے استادِ محترم کو بہت فائدہ پہنچایا۔ پی ایچ ڈی کی تکمیل کے بعد انھوں نے اپنے استاد ڈاکٹر سید عبداللہ کے ایما پر ۱۹۶۲ء میں تاریخ یونی ورسٹی اورینٹل کالج مرتب کی تھی۔ ۱۹۸۰ء میں پنجاب یونی ورسٹی کے قیام کو سو برس ہو چلے تھے، اربابِ یونی ورسٹی کو خیال آیا کہ یونی ورسٹی کی تاریخ لکھوائی جائے۔ قرعہ فال ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب کے نام نکلا۔ (شعبۂ تاریخ کا کوئی استاد اس کام کے لیے موزوں نہیں پایا گیا؟ تعجب ہے) انھوں نے درس و تدریس کے ساتھ تاریخ نویسی کا سلسلہ بھی جاری رکھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہمہ تن تاریخِ جامعہ لکھنے میں منہمک ہو گئے۔ شعبۂ پنجابی کے لیکچرر خالد ہمایوں صاحب ان کے معاون مقرر ہوئے، لیکن زیادہ تر کام انھوں نے تن تنہا انجام دیا۔ راقم شعبۂ اردو میں ان کا رفیق کار تھا۔ وہ اسالیب نثر کا پرچہ پڑھاتے تھے، اب اس کی تدریس میرے سپرد ہوئی۔ بارہا مشاہدہ ہوا کہ اورینٹل کالج کی شمال مشرقی قطار کے آخری کمرے میں (جہاں بعدازاں راقم اور تحسین فراقی بیٹھا کرتے تھے۔) موسم سرما کی خنک اور کبھی گرما کی حبس زدہ شاموں کو فائلوں اور یونی ورسٹی کے پرانے بوسیدہ کاغذات کے درمیان گھرے ہوئے وہ اپنے کام میں منہمک ہیں۔ قدرت نے انھیں یک سوئی کے ساتھ کسی کام میں پوری طرح ڈوب جانے کی عادت سے نوازا تھا۔ پھر موسم گرما میں وہ یونی ورسٹی کے خانس پور کیمپس میں مقیم ہوئے۔ جب وہ کام مکمل کر کے خانس پور سے واپس لاہور آئے تو اکتوبر یا نومبر کا مہینہ تھا۔ کئی مہینے کے بعد ان کو دیکھا۔ واضح طور پر محسوس ہوا کہ اس محنتِ شاقہ نے ان کی صحت کو اچھا خاصا متاثر کیا ہے۔

یونی ورسٹی نے ان کی قدر افزائی کرتے ہوئے مدت ملازمت میں تین برس کی توسیع کر دی مگر وہ اس توسیع سے پورا فائدہ اُٹھانے کے بجائے تدریس اردو کے لیے استنبول چلے گئے۔ استنبول کے پاکستانی سفارت خانے میں بھی ان سے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا اور حسبِ ضابطہ انھیں سہولیات مہیا نہیں کیں۔ (اس کی تفصیل ان کی کتاب، استنبول: سفر و حضر میں دیکھی جا سکتی ہے) مگر ڈاکٹر صاحب اپنی سخت کوش طبیعت اور عاداتِ محبت کی وجہ سے نامساعد حالات سے عہدہ برآ ہونے میں کامیاب رہے۔

بزمِ اقبال کی ۱۷ سالہ معتمدی کا زمانہ بھی، ان کے شعارِ محنت، احساسِ ذمے داری اور علمی انہماک کا ایک تابندہ نقش پیش کرتا ہے۔ انھوں نے آخری دم تک تحقیق و تصنیف کا سلسلہ جاری رکھا اور بزمِ اقبال کے مجلے اقبال کی اشاعت کو بھی باقاعدہ بنا دیا۔ عملے کی

کمی اور محدود وسائل کے باوجود، ان کی یہ خوبی قابل داد ہے کہ رسالہ ہر سہ ماہی کے آغاز میں شائع ہو کر قارئین تک پہنچ جاتا تھا۔

ڈاکٹر غلام حسین ایک سچے اور کھرے محقق اور مصنف تھے۔ ہر طرح کی شہرت اور ناموری سے بے نیاز رہتے ہوئے، اپنے کام میں منہمک رہے۔ انھیں نہ تو یہ خواہش ہوتی تھی کہ ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے، کوئی ان پر مضمون لکھے یا ان کی کتاب پر تبصرہ ہی کردے یا ان کی کوئی کتاب انعام یا ایوارڈ کے لیے پیش کی جائے۔ ان کے دوست میرزا ادیب نے جب ان سے شکوہ کیا کہ انھوں نے اپنی پہلی وقیع تصنیف (اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر) کو آدم جی ایوارڈ کے لیے پیش کیوں نہیں کیا تو ڈاکٹر غلام حسین نے کہا کہ میں نے عمداً ایسا نہیں کیا کیوں کہ ایک نصب العین یا مشن میرے پیش نظر رہا اور مجھے یہ پسند نہیں کہ اس مشن کی خاطر جو صلاحیت اور نعمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے عطا ہوئی ہے اس کا صلہ یا انعام ماسوا اللہ کسی سے مانگوں۔ میرا یہ احساس رہا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو اس نعمت سے محروم ہو جاؤں گا۔ (ص ۳۰۶)

انسان کی کسی طرح کی صلاحیت اور قابلیت اللہ کی جانب سے ایک نعمت ہے، مگر کم لوگوں کو اس نعمت اور اس کے صحیح استعمال کا احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین صاحب انھیں لوگوں میں سے تھے۔ انھوں نے اللہ کی نعمتوں کا صحیح استعمال کیا۔ اللہ انھیں اس کے بہترین اجر سے نوازے گا۔ انشاء اللہ ڈاکٹر صاحب کم آمیز تھے۔ ان کے بارے میں عام تاثر یہ ہے (اور بڑی حد تک درست) کہ وہ سخت گیر اور خشک مزاج شخص ہیں مگر ان کی خودنوشت سے پتا چلتا ہے کہ اس اکھل کھرے شخص کے پہلو میں ایک نرم و گداز دل دھڑکتا تھا (ایک زمانے میں انھیں مصوری اور تصویر کشی سے بھی بہت رغبت رہی) وہ کہتے ہیں کہ میرے دوستوں نے میری کم آمیزی کو میری ترش روئی پر محمول کیا۔ وہ کبھی میرے دل میں جھانک کے یہ نہ دیکھ سکے کہ میرا دل کتنا گداز ہے اور اس دلِ مرحوم میں کتنی شوخیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ لیکن اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا کیوں کہ میں نے کسی کو بھی اپنے دل کے اندر جھانکنے کا موقع نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میرا قریبی سے قریبی دوست بھی میرے حالات و کیفیات کی صرف خارجی سطح کو ہی دیکھ سکا۔ (ص ۳۴۸)

خدا ان کی مغفرت کرے۔ اب ان جیسا کوئی شخص، معلم، اور محقق نہ تو اورینٹل کالج میں نظر آتا ہے اور نہ کسی علمی یا ادبی ادارے میں۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار تدریس اور تحقیق و تصنیف کے امتزاج کی ایک خوبصورت مثال تھے یہ ایسی منفرد مثال ہے جو شاید ہی ہمیں کہیں نظر آئے۔

۲۰۰۶ء کی اہم ادبی کتابیں۔ایک جائزہ

ڈاکٹر اسد فیض

کتابیں انسانی ذہنوں اور دلوں کو روشن رکھتی ہیں۔ ان میں کسی خاص عہد اور معاشرت کا حقیقی اور سچا عکس ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا ہے۔ ۲۰۰۶ء میں پاکستان کے طول و عرض میں بلاشبہ سیکڑوں کتب شائع ہوئیں۔ ان میں چاروں صوبوں میں بولی جانی والی علاقائی زبانوں میں شائع ہونی والی کتب الگ ہیں۔ گزشتہ دو برس دو کتابوں نے خاص طور پر مقبولیت حاصل کی۔ ان میں ایک کا تذکرہ سیاسی اور دوسری کتاب کا چرچا ادبی حلقوں میں رہا۔ پہلی کتاب جنرل پرویز مشرف کی ''ان دی لائین آف فائر'' ہے۔ جس کا اردو ترجمہ سب سے پہلے پاکستان کے عنوان سے راولپنڈی سے طبع ہوا ہے۔ یہ ۴۱۸ صفحات کی ضخامت پر مبنی صدر پاکستان کی یادداشتوں پر مشتمل ایک دلچسپ اور معلوماتی کتاب ہے۔ قاری کے لیے صدر مشرف کی مہمات سے پُر زندگی اور ان کے سیاسی کیریئر کے ابتدا کی کہانی جو ہائی جیکنگ سے شروع ہوتی ہے اور دہشت گردی سے ان کا سامنا پُر تجسس اور قابل توجہ حصے ہیں۔ دوسری کتاب پاک و ہند کے معروف ادیب شمس الرحمٰن فاروقی کا نیا ناول ہے جو ''کئی چاند تھے سر آسماں'' کے نام سے کراچی سے طبع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں اس دور کی مسلم معاشرت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ناول مسلم تاریخ اور ثقافت کا ایسا مرقع ہے جس نے نہ صرف اس دور کو زندہ کر دیا ہے بلکہ تاریخ کے حوالے سے حالات و واقعات کے نئے رخ سامنے لائے گئے ہیں جن کی روشنی میں اس دور کی تاریخ کو نئے سرے سے لکھنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ ناول میں زبان و بیان خصوصاً مسلم سماج کی روایات، لباس اور اقدار کا بیان قاری کو کشش کے حصار میں رکھتا ہے۔ ناول کی صنف کے لیے گزشتہ برس بے حد سازگار رہا ہے کہ اس دوران بے حد عمدہ اور یادگار ناول پاکستان میں طبع ہو کر منظر عام پر آئے۔ عالمی سطح پر بھی ناول کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ برس کا ادب کا نوبل انعام بھی ترکی کے ایک ناول نگار اورحان پامک کو دیا گیا۔ گزشتہ برس پاکستان میں جو دیگر اہم اور یادگار ناول طبع ہوئے۔ ان میں ابدال بیلا کا تحریر کردہ ایک ضخیم اور خوبصورت ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' گزشتہ برس لاہور سے طبع ہوا۔ اس ناول کا شمار اردو کے طویل ناولوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ابدال بیلا کا ادبی تعلق دبستان مفتی سے ہے۔ انھوں نے ناول میں کہانی در کہانی خیر و شر کی قوتوں کے مابین ازل سے جاری رزم آرائی کے تناظر میں زندگی کی معنویت کو اجاگر کیا ہے۔ ناول کے تیور بتاتے ہیں کہ یہ ابدال بیلا

کی ادبی میں شناخت اور نیک نامی کا باعث ہوگا البتہ قاری پر ناول کی قیمت ایک بھاری بوجھ ہے جو پندرہ سو روپے ہے۔ اس لحاظ سے یہ اردو کا مہنگا ناول ہونے کا بھی اعزاز رکھتا ہے۔ لاہور سے سلیم شاہد کا ایک ناول ''رفتہ'' کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔ اس میں دو مختلف تہذیبوں یعنی انسانوں اور پریوں کے گرد کہانی کا تانا بانا ترتیب دیا گیا ہے جو کہ مصنف کی ایک فنتاسی (Fantasy) ہے۔ اس میں پاکستانی معاشرت، سیاست اور تصوف کے معاملات کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ بھی ایک منفرد اور دلچسپ ناول ہے۔ ''دوڑتا چلا گیا'' ظفر اللہ پوشنی کا ناول ہے جو کراچی سے شائع ہوا ہے اس میں میڈیا کے اداروں میں ملازمین کے شب و روز اور سماجی تعلقات کو زیر بحث لایا گیا ہے خاص طور پر اشتہاری ایجنسیوں میں ملازم خواتین کی سرگرمیوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اکرام بریلوی کینیڈا میں مقیم پاکستانی شاعر اور ادیب ہیں کراچی سے ہی ان کا نیا ناول ''حسرت تعمیر'' کے نام سے منصۂ شہود پر آیا ہے۔ اکرام بریلوی کا پہلا ناول نیا افق ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ ان کا ساتواں ناول ہے۔ اس میں انھوں نے بین الاقوامی سیاست خصوصاً افغانستان میں طالبان کے تسلط اور امریکی حملے کے تناظر میں افغانی قوم کو جن حالات کا شکار ہونا پڑا اور اس کے نتیجے میں جو نفسیاتی اور سماجی عوارض ان کی زندگیوں میں پیدا ہوئے کا احاطہ کیا ہے۔ لیکن اس خطے کے مستقبل کے بارے میں ان کا ذاتی موقف جو یورپ کے نقطۂ نظر کے تابع ہے کسی طرح قاری کے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ ایک اور قابل ذکر ناول ''۳۱۳ بریگیڈ'' ہے۔ جس کے مصنف انیس ناگی ہیں یہ بھی گزشتہ برس لاہور سے شائع ہوا ہے۔ یہ مصنف کا بارہواں ناول ہے۔ اس میں افغانستان میں امریکی حملے، پاکستان میں دہشت پسندوں کی سرگرمیوں اور گوانتاموبے کے قید خانے میں مسلمان قیدیوں سے غیر شریفانہ سلوک کو کہانی کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ انیس ناگی کے ناول منافقت، استحصال اور ہمارے معاشرے میں فرد کو درپیش سیاسی، مذہبی جبر کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ انھوں نے اپنی آزاد نظموں کو بھی ایک تجربے کے طور پر اپنے اس ناول میں پیش کیا ہے۔ ناول کی صنف میں نئے تجربات کو بھی اہمیت دی جارہی ہے۔ اس قسم کا ایک ناول ''غلام باغ'' کے نام سے لاہور سے شائع ہوا ہے۔ جس کے مصنف مرزا اطہر بیگ ہیں۔ ''غلام باغ'' ایک سیاسی و تہذیبی استعارہ ہے۔ جس میں بنیادی کرداروں کے جذبات و احساسات کو علامت کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ناول کے تیس ابواب ہیں اور اس کی ضخامت ۸۷۸ صفحات ہے۔ ناول ادب کے سنجیدہ قارئین کو دعوت فکر دیتا ہے۔ ''میں اور موسیٰ'' عذرا عباس کا ناول ہے جس میں خواب اور زندگی کی سچائیوں کو مربوط کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس میں ایک لڑکے کی معاشرے کے بارے میں سوچ و فکر کو کہانی کی صورت میں دی گئی ہے۔ مصنفہ نے کہانی کے بیان میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھی بھرپور اظہار کیا ہے۔ یہ مختصر ناول کراچی سے طبع ہوا ہے۔ کراچی ہی کے سلیم شہزاد ناول نگاری اور تراجم کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں ''شہر نگاراں'' کے نام سے ان کا نیا ناول گزشتہ برس شائع ہوا ہے۔ ناول کی کہانی مغربی معاشرت اور اس کے ماحول کی عکاسی کرتی ہے جس کا انداز جاسوسی ناولوں سے ملتا جلتا ہے۔ لاہور سے علی نواز شاہ نے ایک منفرد موضوع پر ناول لکھا ہے۔ جو ہیجڑوں کے حالات اور سرگرمیوں کے بارے میں ہے۔ اس کا نام ''گرو ماں'' ہے۔ ناول نگار نے اس موضوع پر موثر انداز میں اصل حالات و واقعات کو کہانی کے انداز میں پیش کیا ہے۔ ''لندن کی وہ شام'' عمران اقبال کا ایک معاشرتی ناول ہے۔ جس میں زندگی اور معاشرت کے تضادات اور فرد پر ماحول کے

اثرات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ فکشن کی دوسری اہم صنف افسانہ میں گزشتہ برس نو جوانوں کے ساتھ تمام اہم افسانہ نگاروں کے افسانوں مجموعے بھی زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئے جس نے اس صنف کا نہ صرف اعتبار قائم رکھا ہے بلکہ مقبولیت میں بھی اضافہ کیا ہے۔ سینئر افسانہ نگاروں میں انوار احمد زئی کا افسانوی مجموعہ ''دل دریچے'' حیدرآباد سے طبع ہوا ہے۔ انوار احمد زئی ساٹھ کی دہائی سے افسانہ لکھ رہے ہیں اور انھوں نے ہمیشہ افسانہ کو مقصدیت کے تابع اور روایت سے پیوست رکھا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں جو خانگی اور انسان کی جذباتی زندگی سے جنم لیتی ہیں۔ ان کہانیوں میں سندھ کا کلچر اور روایت کا بیان انھیں معاصر افسانہ نگاروں میں ممتاز کرتا ہے جو ان کی اپنی ثقافت اور دھرتی سے گہری وابستگی کا مظہر ہے۔ اس مجموعے میں بیس کہانیاں ہیں۔ کراچی سے احمد صغیر صدیقی کی تحریر کردہ کہانیوں کا مجموعہ ''ادھ کھلی کھڑکیاں'' شائع ہوا ہے۔ احمد صغیر صدیقی تراجم کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ میں سترہ طبع زاد کہانیاں شامل ہیں۔ یہ کہانیاں ہمارے اردگرد رہتے بستے کرداروں کی زندگیوں کو پیش کرتی ہیں۔ جن کا بیان فنکارانہ ہے۔ مسعود مفتی المیہ مشرقی پاکستان کے بارے میں افسانے اور رپورتاژ لکھنے کے حوالے سے معروف ہیں۔ گزشتہ برس ان کے افسانوں کا تازہ مجموعہ ''توبہ'' کے نام سے لاہور سے شائع ہوا ہے۔ مسعود مفتی کی کہانیاں ملک میں عدم سیاسی استحکام، آمریت کے جبر اور معاشرے میں انصاف کے فقدان جیسے موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں سے پاکستان کی سماجی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ اسد محمد خان کا شمار اردو کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا گزشتہ برس ایک نیا افسانوی مجموعہ ''تیسرے پہر کی کہانیاں'' اور ۶۴ صفحات پر مبنی افسانوی کلیات ''جو کہانیاں لکھیں'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے اسد محمد خاں کے افسانوں، تراجم اور شاعری کی چھ کتب چھپ چکی ہیں۔ ان کے افسانے احساس اور تجربے کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ غلام الثقلین نقوی (۱۹۲۲۔۲۰۰۲ء) معروف افسانہ نگار تھے گزشتہ برس سجاد نقوی نے ان کے سات افسانوی مجموعوں سے انتخاب کر کے پچیس افسانے بہ عنوان ''غلام الثقلین نقوی کے پچیس منتخب افسانے'' لاہور سے شائع کیے۔ غلام الثقلین نقوی اپنی طرز کے ایک اہم افسانہ نگار تھے۔ ان کا یہ مجموعہ قارئین سے اس اہم افسانہ نگار کے نایاب افسانوں کو متعارف کرانے کا موجب ہوگا۔ ڈاکٹر رشید امجد کی پہچان علامتی اور تجریدی افسانہ ہے لیکن اپنے نئے افسانوی مجموعہ ''ایک عام آدمی کا خواب'' میں جو افسانے انھوں نے تحریر کیے ہیں اس میں کلاسیکل افسانے کی روایت کو نبھایا ہے۔ چند علامتی افسانوں میں بھی علامتوں کی گرہ عام قاری کی دسترس میں ہے۔ اس مجموعہ میں اکیس کہانیاں ہیں جب کہ کتاب کے آخر میں انھوں نے اپنے فن کی تفہیم کے حوالے سے ''میں اور میرے کردار'' کے عنوان سے اپنا ایک مضمون شامل اشاعت کیا ہے۔ منشا یاد اردو کے سینئر افسانہ نگار ہیں جنوری ۲۰۰۶ء میں ان کا افسانوی مجموعہ ''سرائے'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ لیکن اس پر تاریخ دسمبر ۲۰۰۵ء کی پرنٹ ہے۔ منشا یاد نصف صدی سے افسانہ لکھ رہے ہیں اور پاک و ہند میں مقبول اور اہم افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات انسانی مسائل اور ان دیکھے دکھ ہیں جو انسان کو گھیرے رکھتے ہیں۔ تازہ مجموعہ میں ان کے افسانچے بھی شامل ہیں۔ محمد کبیر خان کے افسانے ''شاکس آفٹر شاکس'' کے عنوان سے حیدرآباد سے شائع ہوئے ہیں اس میں بارہ افسانے شامل ہیں۔ یہ افسانے ۲۰۰۵ء کے کشمیر اور سرحدی علاقوں میں زلزلہ کی تباہ کاریاں سے متعلق ہیں۔ ان میں اس قدرتی آفت سے دوچار ہونے والوں کے

واقعات کو افسانوں کا روپ دیا گیا ہے۔ اسلام آباد میں مقیم لبابہ عباس کی کہانیاں عورتوں کے مسائل کا احاطہ کرتی ہیں اور خاص طور پر خانگی زندگی کی پیچیدگیوں کو عیاں کرتی ہیں۔ عورت ہونے کے ناتے انھوں نے عورت کے صنفی مسائل کی تشریح میں اہم کردار ادا کیا ہے کہ اَن کہی باتوں کو سلیقے سے ضابطہ تحریر میں لا کر ادب کا حصہ بنا دیا ہے۔ ''اندھیری رات کی دستک'' کے عنوان سے ان کا تازہ افسانوی مجموعہ جس میں بیس کہانیاں ہیں ایسے ہی موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ فیصل آباد سے گلزار ملک کا ایک افسانوی مجموعہ ''آگ'' اسلام آباد سے کوثر جمال کا افسانوی مجموعہ ''جہاں گرد'' لاہور سے فہمیدہ کوثر کا افسانوی مجموعہ ''دھوپ کا مسافر'' اور ایوب اختر کا مجموعہ جس میں سولہ افسانے ہیں ''پچھلے کی بارش'' کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔ تنقید ادب کا ایسا شعبہ ہے جس کا وجود ادب کی تفہیم و تشریح حتیٰ کہ معاشرہ کی نمو کے لیے بھی از حد ضروری ہے لیکن شرط یہ ہے کہ تنقید مثبت ہو اور سیاق و سباق کے اندر رہ کر تحریر کی گئی ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نقاد اس کا اہل بھی ہو۔ گزشتہ برس نقد ادب کے تحت جو کتب یا مضامین کے مجموعے شائع ہوئے ان میں فکشن کی تنقید پر ایک اہم مجموعہ ''اردو افسانہ صورت و معنی'' ہے۔ جسے یاسین آفاقی نے مرتب کیا ہے اور یہ اسلام آباد سے شائع ہوا ہے۔ اس میں افسانہ نگار حمید شاہد کے فکشن کی تنقید پر لکھے گئے مقالات شامل ہیں۔ حمید شاہد خود معروف افسانہ نگار ہیں اس حیثیت سے انھوں نے اردو افسانے کی تشریح و توضیح میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اور افسانے کی نئی بوطیقا ترتیب دینے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ''ناکام محبت'' ساحر لدھیانوی پر اظہر جاوید کی ایک دلچسپ کتاب ہے۔ جس میں معروف شاعر ساحر لدھیانوی کی ذات کے مخفی گوشوں کا تجزیہ اور اس کی ناکام زندگی کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ امین راحت سینئر ادیب و نقاد ہیں۔ ان کے علمی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''ردعمل'' کے نام سے راولپنڈی سے شائع ہوا ہے۔ جس میں شخصیات، سیاسیات اور مطالعات کے عنوان سے مضامین شامل کتاب ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کراچی میں مقیم ترقی پسند ادیب و نقاد ہیں۔ گزشتہ برس جوش ملیح آبادی پر ان کی ایک خوبصورت کتاب ''جوش ملیح آبادی۔ ایک مطالعہ'' شائع ہوئی ہے۔ جس میں جوش کی شاعرانہ شخصیت کے نئے پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شہاب دہلوی (۱۹۲۲۔ ۱۹۹۰ء) بہاول پور میں مقیم شاعر اور ادیب تھے ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ان کے مضامین کو ''شہاب کا جہانِ تخلیق'' کے عنوان سے مرتب کیا ہے۔ شہاب دہلوی نے تمام زندگی ادب اور صحافت کو عبادت کی طرح اپنائے رکھا۔ خواجہ غلام فریدؒ اور بہاول پور کی ادبی و ثقافتی تاریخ سے انھیں زیادہ دلچسپی تھی۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ان کے اہم مضامین اور خطوط کو مرتب کر کے اس عظیم ادیب و دانشور کو نئی نسل سے متعارف کروانے کی ایک قابل قدر سعی کی ہے۔ رابعہ سرفراز فیصل آباد میں مقیم ادیبہ و شاعرہ ہیں ان کے مختلف موضوعات پر مبنی تنقیدی و تحقیقی مقالات کا مجموعہ ''توضیحی مطالعات'' کے عنوان سے فیصل آباد سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں شاعری، تحقیق اور تنقید پر اکیس مضامین شامل ہیں۔ رابعہ کا اسلوب بیان تشریحی ہے جب کہ مضامین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادب کی مختلف اصناف پر ان کی نظر گہری اور مطالعہ وسیع ہے۔ آصف فرخی نے نامور افسانہ نگار انتظار حسین کی مختلف تحریروں کو 'انتظار حسین گنی چنی تحریریں'' کے عنوان سے یکجا کر کے طبع کیا ہیں۔ اس میں انتظار حسین کے فن پر تنقیدی مضامین، ان کے منتخب افسانے، ڈرامے، ناول اور خودنوشت کے کچھ حصے بھی شائع کیے گئے ہیں۔ انتظار حسین کی شخصیت اور فن کی تفہیم کے حوالے سے یہ ایک اہم کاوش ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری محقق اور

نقاد ہیں۔ گزشتہ برس ان کی کتاب ''اردو فکشن کی تاریخ'' شائع ہوئی۔ یہ فکشن کی تنقید پر مبنی کتاب نہیں بلکہ مختلف عنوانات پر فکشن کے بارے میں ان کے مضامین اس عنوان سے شائع کیے گئے ہیں۔ کتاب کی ضخامت ۲۵۶ صفحات ہے۔ اور یہ لاہور سے طبع ہوئی ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے گزشتہ برس پاکستانی ادب کے معماروں کے سلسلے کی چند کتب طبع کی ہیں۔ ان میں ایک عمدہ تصنیف ''ڈاکٹر وزیر آغا شخصیت وفن'' کے عنوان سے طبع کی گئی ہے جسے رفیق سندیلوی نے تحریر کیا ہے۔ اس کتاب میں عہد حاضر کے اہم نقاد اور شاعر ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت اور فن کو موضوع بنایا گیا ہے۔ رفیق سندیلوی نے اپنے علاوہ دیگر ناقدین کی آرا کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ جب کہ کتاب کی ضخامت بے حد مختصر ہے۔ ''مجموعہ'' ڈاکٹر سلیم اختر کے ادبی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین گزشتہ برسوں میں مختلف ادبی جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ جنھیں اس مجموعہ میں یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے۔ ''جدید اردو نظم کے ارباب اربعہ'' ڈاکٹر انور سدید کی تنقیدی کتاب ہے جس میں ن۔م۔ راشد، مجید امجد، وزیر آغا، عزیز حامد مدنی، عارف عبدالمتین اور الطاف گوہر کی نظم نگاری کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔ ''ادبیات عالم میں سیر افلاک کی روایت'' ڈاکٹر اسلم انصاری کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو لاہور سے شائع ہوا ہے یہ مجموعہ اپنے موضوعات کی انفرادیت کی وجہ سے اہم ہے۔ مجموعہ کے دیگر قابل مطالعہ مضامین میں، بیسوی صدی میں المیہ طرز احساس کی نمو، حرف ونغمہ اور خاموشی کی مابعدالطبیعات، الم حیات اور مذاہب عالم اہم ہیں۔ ''میر امن سے انتظار حسین تک'' ڈاکٹر محمد کامران کا تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں داستان، ناول اور ڈراما کے عنوان سے تنقیدی مضامین شامل ہیں جو زیادہ تر ایم اے اردو کے طلبا کے نصابی ضروریات کے پیش نظر تحریر کیے گئے ہیں۔ ''ورق ورق آئینہ'' کشور ناہید کے مضامین اور کالموں کا مجموعہ ہے جو منفرد، موضوعات اور اسلوب کا حامل ہے۔ اردو دنیا کے دو اہم انڈین ادیبوں گوپی چند نارنگ اور شمیم حنفی کی کتب بھی پاکستان میں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں پہلی کتاب گوپی چند نارنگ کی مرتب کردہ ہے جس میں ہندوستان کے معروف ناقدین کے ولی دکنی کی شاعر وفن پر مضامین کو مرتب کیا گیا ہے۔ کتاب کا نام ''ولی دکنی، تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر'' ہے۔ جب کہ دوسری کتاب کا نام ہے ''جدیدیت کے بعد'' اس میں جدیدیت کے بارے میں مباحث کو جو شاعری، افسانہ، مکالمات کے عنوان سے ہیں پیش کیا گیا ہے۔ شمیم حنفی کی تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ''تاریخ، تہذیب اور تخلیقی تجربہ'' لاہور سے طبع ہوئی ہے۔ جس میں اردو کے کلاسیکل شعرا، ناول اور اردو کے چند اہم ناقدین پر تحریریں شامل اشاعت ہیں۔ شمیم حنفی اردو کے ایک اہم نقاد ہیں کہ ان کی تحریریں عالمانہ اور دانشورانہ احساس سے عبارت ہیں۔ ایک اور اہم اور قابل مطالعہ کتاب شیریں زادہ خدوخیل کی تصنیف ''عہد نبوی میں شعر وادب'' ہے کتاب لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ اور اس کی ضخامت ۲۵۶ صفحات ہے۔ اس کے عنوانات میں دور جاہلیت میں عربی ادب، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کا ادبی پس منظر، رسول اکرم اور شعر وشاعری، عہد نبوی کا ادبی منظر نامہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کے سچل سرمست کے فکر وفن پر لکھے گئے مضامین کا انتخاب ''سچل سرمست۔ محبتوں کا پیامبر'' کے عنوان سے شاہ عبداللطیف یونی ورسٹی خیر پور کی سچل چیئر کے زیر اہتمام شائع کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے حضرت سچل سرمست کی شاعری کا جائزہ ان کی اردو اور سرائیکی شاعری کے تناظر میں لیا ہے۔ ''فن نعت کی نئی جہات'' محمد حیات چغتائی کی کتاب ہے جو بہاول پور سے طبع ہوئی ہے۔ اس میں انھوں نے

ڈاکٹر طاہر تونسوی کے نعت کے موضوع پر لکھے گئے مضامین کو کتابی صورت میں مرتب کر دیا ہے۔ کتاب میں تاریخ نعت گوئی اور سرائیکی میں نعت گوئی کے عناصر، قدیم اور جدید نعت گوئی کا ادبی محاکمہ جیسے اہم مضامین نے اس کی قدر و قیمت کو دو چند کر دیا ہے۔ پطرس بخاری اردو صف کے مزاح نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کے نادر و نایاب مضامین، تراجم، خطوط، خطبات اور افسانوں کو یکجا کر کے محمد نواز چوہدری نے کلیات پطرس کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ اس طرح قاری کے سامنے پطرس صرف ایک مزاح نگار ہی نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ علامہ اقبال کے فکر و فن پر گزشتہ برس چند اہم کتب طبع ہوئی ہیں جو اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کو دعوت فکر دیتی ہیں۔ ''اکبر اور اقبال نئے تناظر میں'' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی کتاب ہے جو لاہور سے طبع ہوئی ہے۔ اس میں اکبر الٰہ آبادی اور اقبال کی شاعری اور فکر کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی ذہنی و فکری مماثلتوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں پروفیسر مرزا منور نے اقبالیات کے فروغ کے لیے جو مخلصانہ کوششیں کی ہیں ان کے اعتراف کے حوالے سے علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی میں ان پر ایم فل کا ایک مقالہ لکھا گیا ہے جس پر مقالہ نگار زبیدہ جبیں کو ۲۰۰۳ء میں ڈگری دے دی گئی۔ اب اس مقالے کو اقبال اکادمی نے لاہور سے شائع کیا ہے۔ یہ پانچ ابواب پر مشتمل مقالہ ہے۔ جس میں مرزا محمد منور کی شخصیت اور فکر اقبال سے وابستگی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ''اقبال کا نظریہ فن'' رابعہ سرفراز کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھوں نے علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی ہے۔ یہ مقالہ گزشتہ برس فیصل آباد سے شائع ہوا ہے۔ اس میں اقبال کی شاعری اور نثر کے حوالے سے ان کے نظریہ فن کو تلاش اور بیان کرنے کی کامیاب سعی کی گئی ہے۔ سمیرا نسرین نے باقیات شعر اقبال، کا اشاریہ مرتب کیا ہے۔ جسے اقبال اکادمی لاہور نے شائع کیا ہے۔ اس میں مصرع وار ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ سفرنامہ اردو میں اب ایک مقبول صنف ہے۔ گزشتہ برس دو اہم سفرنامہ نگاروں نے اپنی کتابوں سے اس مصنف کی توقیر و مقبولیت میں اضافہ کیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے تین سفرنامے اکٹھے شائع ہوئے۔ ''سنہری الو کا شہر'' مستنصر کا ہندوستان کا سفرنامہ ہے جسے انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں قلم بند کیا ہے۔ جب کہ باقی دو حج نامہ اور رپورتاژ کی ذیل میں آتے ہیں۔ اپنے سفر حج کو انھوں نے منہ دل کعبہ شریف کے نام سے اور غارِ حرا میں ایک رات، غار حرا میں بسر کی گئی ایک، رات جو دراصل ایک محبت نامہ ہے کی روداد خوبصورت اور دل پذیر انداز میں رقم کی گئی ہے۔ قمر علی عباسی بھی مستقل مزاجی سے سفرنامہ کی صنف کو اپنائے ہوئے ہیں ان کا بھی ایک خوبصورت سفرنامہ ''کیپیڈا انتظار میں ہے'' گزشتہ برس کراچی سے شائع ہوا۔ اسلام آباد سے محمود اختر سعید نے انگلینڈ و اسکاٹ لینڈ کا اپنا سفرنامہ ''قریہ قریہ کو بہ کو'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ واقعات کا بیان بے حد دلچسپ ہے۔ یہ قاری کو نہ صرف ان ممالک کے ماحول، ثقافت تاریخی مقامات سے متعارف کرواتا ہے بلکہ وہاں آنے جانے کے لیے معلومات کا عمدہ ذریعہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ حکیم وحید اختر ثنائی نے ہندوستان کے سفر کو ''جمنا کنارے'' کے عنوان سے اور رضا الحق صدیقی نے اپنے حج کے سفر کو ''حرمین کی گلیوں میں'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ آپ بیتی کی ذیل میں جو اہم کتب شائع ہوئیں۔ ان میں یوسف رضا گیلانی کی ''چاہ یوسف سے صدا'' اور جاوید ہاشمی کی ''میں باغی ہوں'' سیاسی آپ بیتیاں ہیں، ''میری آخری منزل'' جنرل اکبر خاں کی خودنوشت ہے جو پاکستان آرمی کے پہلے سپہ

سالار تھے یہ ان کی فوجی زندگی کی کہانی ہے۔ ادبی آپ بیتوں میں وقار بن الٰہی کی خودنوشت ''ماں تھک گیا ہوں'' ایک دلچسپ اور قابل مطالعہ کتاب ہے۔ انھوں نے اپنے ادبی کیریئر کے علاوہ اپنی ملازمت کے شب و روز کا بیان بھی تفصیل سے کیا ہے۔ جسے پڑھ کر سابقہ ادوار میں وزارت تعلیم میں ہونے والی بے قاعدگیوں، فرضی اور دکھاوے کی کارکردگی اور ملک میں تعلیمی انحطاط کے اصل اسباب جاننے کا موقع ملتا ہے۔ ابتدائی دنوں کے اسلام آباد کی سماجی زندگی اور ادبی سرگرمیوں کی تفصیل بھی اس کتاب کے حوالے سے محفوظ ہو گئی ہے۔ جرمنی میں مقیم اردو کے افسانہ نگار منیر الدین احمد کا ''زندگی نامہ ڈھلتے سائے'' کے عنوان سے لاہور سے شائع ہوا ہے۔ اس آپ بیتی کے سات ابواب ہیں جن میں منیر الدین احمد نے پاکستان میں اپنی ابتدائی زندگی اور بعدازاں جرمنی کے شب و روز کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی عنوان سے یہ آپ بیتی سلسلہ وار ادبی جریدہ ''سویرا'' میں شائع ہوتی رہی ہے۔ صبیح محسن براڈ کاسٹر ہیں اور ادب کا ذوق رکھتے ہیں ان کی دلچسپ خودنوشت ''داستان کہتے کہتے'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ جس میں انھوں نے زیادہ تر ریڈیو کی ملازمت کے دنوں کی اپنی یادداشتوں کو قلم بند کیا ہے۔ عائشہ مسعود نے پاکستان میں اردو صحافت کی اہم شخصیت مجید نظامی کی یادداشتوں کو ''جب تک میں زندہ ہوں'' کے عنوان سے قلم بند کیا ہے۔ گزشتہ دو برس اردو تحقیق کے لیے بے حد سازگار ہے کہ پاکستان میں مرد تحقیق مشفق خواجہ اور ہندوستان میں رشید حسن خاں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس طرح اردو تحقیق کا ایک باب جو جرات، محنت اور دیانت داری سے عبارت تھا بند ہو گیا، رہ گئی جامعات میں تحقیق کی روایت تو وہ پہلے ہی دونوں جانب بے حد کمزور ہے۔ ایک ہی موضوع پر دو جامعات، ایم اے کی سطح کے تحقیقی کام پر پی ایچ ڈی کی ڈگری اور ایم فل کے موضوع کی توسیع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری جیسی غلط بخشیاں پاکستانی جامعات میں عام ہیں۔ اس ماحول میں بھی چند عمدہ مقالے بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں جن سے تحقیق کا اعتبار قائم ہے۔ اس حوالے سے مسرور احمد زئی کا ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان پر پی ایچ ڈی کا مقالہ قابل ذکر ہے۔ انھوں نے نہایت محنت اور سلیقے سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی ادبی اور دینی خدمات کا احاطہ کیا ہے کہ یہ ایک حوالہ کی حیثیت کا حامل تحقیقی کام بن گیا ہے۔ مقالہ کے نو ابواب ہیں اور اس کی ضخامت ۹۳۶ صفحات ہے۔ دیگر تحقیقی مقالات میں منٹو پر علی ثنا بخاری کا تحقیقی مقالہ جس پر ۱۹۸۸ء میں پنجاب یونی ورسٹی نے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی تھی گزشتہ برس طبع ہوا۔ یہ کوئی متاثر کن کام نہیں ہے کہ پہلے سے دستیاب مواد کو صرف منٹو کے عنوان سے جمع کیا گیا ہے حالاں کہ تحقیق صرف جمع آوری نہیں۔ منٹو کے تراجم پر الگ سے ایک باب کی ضرورت تھی لیکن اسے اہمیت نہیں دی گئی۔ منٹو پر گزشتہ برس جو دیگر کتب طبع ہوئیں ان میں خالد ارمان کی کتاب ''منٹو باقیات'' اہم ہے۔ اس میں منٹو کے منتشر اور غیر مطبوعہ افسانوں کو مدون کیا گیا ہے۔ ۲۶۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب دو حصوں پر منقسم ہے۔ پہلا حصہ نوادرات منٹو ہے جس میں نو غیر مطبوعہ اور نایاب افسانے ہیں۔ دوسرا حصہ جواہرات منٹو ہے جس میں اکیس مطبوعہ افسانے ہیں جو پہلی بار کتابی صورت میں شائع کیے گئے ہیں۔ یہ منٹو شناسی کے حوالے سے ایک اہم کتاب ہے اور ایسا کام ہے جس کی اپنی ادبی و تحقیقی افادیت ہے جو جامعات کے تحقیقی کام سے کہیں بہتر بھی ہے۔ جامعہ ملتان کے شعبہ اردو نے ماہنامہ ''ادب لطیف'' کی ادبی خدمات کے عنوان سے ڈاکٹر شگفتہ حسین کا تحقیقی مقالہ شائع کیا ہے جس پر ملتان یونی ورسٹی نے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی تھی۔ مقالہ نگار نے ''ادب لطیف'' میں طبع ہونے والے افسانوں، مقالات اور

شاعری کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے اور اس سے اردو ادب میں جنم لینے والے رجحانات کی نشان دہی کی ہے۔ مقالہ کے آخر میں تمام مشمولات کا اشاریہ بھی بنایا گیا ہے۔ دلشاد اجمل نے عوامی شاعر حبیب جالب پر علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے زیر اہتمام ایم فل کا مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کی تھی۔ اب یہ مقالہ لاہور سے طبع ہوا ہے۔ جس میں سات ابواب میں حبیب جالب کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ''اردو ناول اور آزادی کے تصورات'' پروفیسر ڈاکٹر محمد عارف کی تحقیقی و تنقیدی کتاب ہے جو شاید کسی جامعہ میں پیش کیا گیا مقالہ ہے جس کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ ۱۹۷۴ء صفحات میں اردو کے صرف چند معروف ناولوں کو ہی موضوع بنایا گیا ہے۔ جامعہ ملتان کے زیر اہتمام سرائیکی ریسرچ سینٹر نے خطہ ملتان کی قدیم تاریخ اور ادب کو دریافت اور محفوظ کرنے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اس سلسلے میں موجود قلمی نسخہ جات کا ایک توضیحی اشاریہ ترتیب دیا ہے۔ جسے اجمل مہار ابن اکبر نے مرتب کیا ہے۔ ریسرچ سینٹر ملتان کے ایک شاعر کیفی جام پوری (۱۹۰۵ ـ ۱۹۷۱ء) کا کلیات مرتب کر کے بھی شائع کیا ہے۔ ۲۹۶ صفحات پر مشتمل اس کلیات میں کیفی جام پوری کے اردو، فارسی اور سرائیکی کلام کو محفوظ کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کو ڈاکٹر اسلم عزیز درانی اور شبیر حسن اختر نے مرتب کیا ہے۔ اس اعتبار سے ملتان کی ادبی تاریخ کے ایک خاص عہد کو محفوظ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ممتاز محقق ہیں ور ان کی وجہ شہرت ان کی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' ہے جس کی گزشتہ برس جلد سوم طبع ہوئی ہے اس میں انیسویں صدی کے نصف اول کے شعر و ادب کا مطالعہ و تحقیق شامل ہے۔ کتاب کے پانچ ابواب ہیں اہم موضوعات میں فورٹ ولیم کالج اور آتش کی شاعری کا تجزیہ و تحقیق شامل ہے۔ کتاب کی ضخامت ۱۰۹۵ صفحات ہے۔ یہ لاہور سے طبع ہوئی ہے۔ لکھنؤ انڈیا کا ایک قدیم شہر ہی نہیں تہذیب و تمدن میں بھی یکتا شہر ہے۔ عبدالحلیم شرر نے اس پر گزشتہ لکھنؤ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جسے اب محمد اکرام چغتائی نے حواشی اور فرہنگ سے مزین کر کے لاہور سے شائع کیا ہے۔ شاعری کا چمن ہمیشہ کی طرح سدا بہار ہے لیکن گزشتہ چند برسوں سے نوجوان شعرا کا زیادہ رجحان شاعری کی نئی اصناف مثلاً آزاد نظم اور ہائیکو کی طرف زیادہ ہے۔ گزشتہ برس شاعری کی جو کتب طبع ہوئیں۔ ان میں مجاہد لکھنوی کا مجموعہ ''حمد و نعت چراغ حرم'' پشاور سے، ''عود گلستان رسول'' سلیم اختر فارانی کا نعتیہ مجموعہ گوجرانوالہ سے اور ''ورفعنا لک ذکرک'' سید ذوالفقار حسین نقوی کا نعتیہ مجموعہ کراچی سے شائع ہوا ہے۔ یہ نعتیہ مجموعے محبت و عقیدت کی مہکار سے منور ہیں اور پوری دنیا میں مسلمانوں کو درپیش مسلمانوں کے مسائل اور دنیا میں امن کی دعاؤں سے مامور ہیں۔ شاعری کی دیگر اصناف میں صبا اکرام کی نظموں کا مجموعہ ''آئینے کا آدمی'' اہم ہے۔ اس کا دیباچہ شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے۔ ''جدید نظم کا سفر'' کے عنوان سے صبا اکرام نے ابتدائیہ میں ایک صدی سے زائد نظم نگاری کے سفر کو گویا تاریخ قلم بند کر دی ہے۔ نظم کی تنقید کے لحاظ سے بھی یہ ایک اہم مقالہ ہے۔ اپنی نظموں میں صبا اکرام نے موت، زندگی، ہجرت۔ مذہب موضوعات پر مختصر، معنی خیز نظمیں لکھی ہیں۔ صبا اکرام دو شعر ملاحظہ ہوں۔

صدیوں سے سہہ رہا ہوں صبا بے گھری کا غم
نکلا تھا ایک بار میں اپنے مکان سے

خمیدہ سر کو کیے آج تک کھڑے ہیں ہم
گزر چکی ہے شہنشاہ کی سواری بھی

''رکی ہوئی شام کی راہداریاں'' طارق نعیم کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ جس میں خوبصورت غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ غزل کی کلاسیکی طرز اظہار کی روایت کے ساتھ طارق نعیم نے شام اور اس کی یادوں سے شہر سخن آباد کیا ہے۔ ''ابھی دریا میں پانی ہے'' کے عنوان سے رفیع الدین راز کی نظموں کا ایک مجموعہ کراچی سے طبع ہوا ہے۔ یہ ان کا پانچواں شعری مجموعہ ہے۔ ظفر اقبال موجودہ عہد کے اہم اور نمایاں شاعر ہیں جن کی جدت فکر نے اردو شاعری کو نئی پہچان عطا کی ہے۔ ان کے کلیات غزل کی جلد سوم لاہور سے ''اب تک'' کے نام سے طبع ہوئی ہے۔ غلام حسین ساجد لاہور میں مقیم اہم اور منفرد شاعر ہیں ان کی غزلوں کا مجموعہ لاہور سے معاملہ کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ ان کے دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

نہیں ہے کوئی اگر سلسلہ ہمارے بیچ
تو کیوں پڑی ہے یہ خلق خدا ہمارے بیچ
فضا صباحت موجود سے منور ہے
کہ رکھ دیا ہے کہ کسی نے دیا ہمارے بیچ

پاکستان سے باہر مقام نجم الثاقب کا شعری مجموعہ ''ہزار خواب ہیں'' لاہور سے شائع ہوا ہے۔ اس میں نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جو ان کی کل شعری متاع ہے۔ نجم الثاقب اپنی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں۔

نئے خیال نیا اعتبار لایا ہوں
میں پل صراط سے خود کو گزار لایا ہوں
مبادا پھر سے زمیں والے در بدر نہ کریں
میں آسماں ہی نیچے اتار لایا ہوں

''زلزلہ کی دھول'' کے عنوان سے معروف صحافی اور شاعر محمود شام کے کالموں اور غزلوں کا مجموعہ کراچی سے شائع ہوا ہے۔ اس میں نہایت دردمندی کے ساتھ نثر اور شاعری میں اس سانحہ کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ''آٹھ اکتوبر۔ تحریر کے آئینے میں'' اس عنوان سے اکادمی ادبیات نے چھ سو اکتیس صفحات میں پاکستان میں ۲۰۰۵ء کے زلزلے کے نتیجے میں ہونے والی ہولناک تباہی پر پاکستانی زبانوں میں کی جانے والی شاعری کو مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ ''قہر زمیں'' راغب مرادآبادی کا مجموعہ کلام ہے جس میں ۸/۱ اکتوبر کے زلزلے کے حوالے سے منظومات اور رباعیات شامل ہیں۔ دشت وجود، حمیدہ شاہین کا شعری مجموعہ ہے جو غزلوں پر مشتمل ہے۔ یہ لاہور سے شائع ہوا ہے۔ حمیدہ شاہین کی شاعری میں مشرقی اقدار و روایات کے ساتھ نسائیت کا اظہار اور اپنے وجود کا احساس شاعرہ کے فکر و تخیل کو روشنی عطا کرتا نظر آتا ہے۔ ''صدا کیسی ہے'' صدیق فتح پوری کا شعری مجموعہ ہے جو غزلیہ شاعری پر مبنی ہے زندگی اور اس کی آزمائش کے موضوع کو انھوں نے خوبصورت اشعار میں ڈھالا ہے۔ یہ ان کا تیسرا مجموعہ کلام ہے۔ انھوں نے نعتیہ شاعری بھی کی ہے جس کے دو مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔ غزلیات کا ایک اور مجموعہ تو ''کیا تم لوٹ جاؤ گے'' کے نام سے لاہور سے شائع ہوا

ہے۔ شاعر کا نام ہے نبیل احمد نبیل۔ غزلیات میں خیال کی ندرت اور فکر و نظر کی تازگی کا احساس اس مجموعہ کی نمایاں خوبی ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

یہ اور بات جڑیں اپنی خاکدان تک ہیں
ہماری سوچ کی شاخیں تو آسمان تک ہیں

ہمارے بعد خدا جانے کیسا منظر ہو
ہم آفتاب ہیں اور شام کی اذاں تک ہیں

احمد پور شرقیہ سے ''آدھے بادل آدھی دھوپ'' سجاد راکب، ''حرمت حرف'' ملتان سے غضنفر عباس صدف، ''دھوپ کا سائبان'' لیہ سے شعیب جاذب کی غزلیات کے مجموعے شائع ہوئے ہیں جن میں انفرادی تجربات کے علاوہ اجتماعی مسائل کا اظہار بھی ملتا ہے۔ ''چشم صدف'' غفار بابر کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو ڈیرہ اسماعیل خان سے شائع ہوا ہے۔ مضافاتی شاعری کا رنگ دیکھنے کے لیے دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم وہ مجذوب ہیں جب لہر میں آجاتے ہیں
موت سے ملنے تیرے شہرے میں آجاتے ہیں

کتنے سادہ ہیں میرے گاؤں کے رہنے والے
آئینہ لے کے تیرے شہر میں آجاتے ہیں

۲۰۰۶ء کا یہ جائزہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ تمام اصناف ادب میں کامیابی اور بہتری کا سفر جاری و ساری ہے اور ادیب و شاعر اپنے جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ عصری مسائل کو بھی اظہار کا جامہ پہنا رہے ہیں اور معاشرے میں اپنے کردار کو بھی ادا کرنے میں فعال ہیں اور ہاں! ۲۰۰۷ء کے ادب کے جائزہ کا قرض بعد میں چکایا جائے گا۔

اشاریۂ اردو

مرتب

مصباح العثمان

صفحات: ۱۸۰ قیمت: ۱۰۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

''بیاضِ سحر'' — ایک گم شدہ ناول

انور سدید

اربابِ ادب جانتے ہیں کہ انسان کی طرح کتاب بھی اپنی ایک انفرادی شخصیت رکھتی ہے۔ بعض کتابیں اپنی اس منفرد شخصیت کی بنا پر ہمیں اپنی طرف خود بلاتی ہیں اور پھر طویل عرصے تک جی چاہتا ہے کہ زندگی کا طویل سفر ان کتابوں کی روشنی میں ہی طے کیا جائے۔ بعض کتابیں پہلی ملاقات میں اپنی شخصیت کا تاثر کچھ اس انداز میں مرتب کر دیتی ہیں کہ ایک دفعہ ملنے کے بعد دوسری مرتبہ ملنے کی خواہش ہی پیدا نہیں ہوتی۔ چناں چہ یہ باور کرنا درست ہے کہ جس طرح انسان آپ کے دل میں محبت اور نفرت کے جذبات پیدا کرتا ہے اس طرح کتابیں بھی آپ کے جذبات و احساسات میں مثبت یا منفی تاثر کو جنم دیتی ہیں۔ ان دو اقسام کی کتابوں کے علاوہ معدودے چند ایسی کتابیں بھی ہوتی ہیں جن سے آپ کی ملاقات سرِ راہ ہوتی ہے، اور پھر ریل گاڑی یا کشتی کے مسافر کی طرح ہنگامۂ حیات میں گم ہو جاتی ہے۔ تاہم یہ کتابیں جگنو کی طرح ہمہ وقت ذہن و خیال پر جگمگاتی رہتی ہیں اور ان سے دوبارہ ملنے کی خواہش دل میں بیدار رہتی ہے۔ میں ایسی کتابوں کو ادب کی گم شدہ کتابیں شمار کرتا ہوں۔

عرصہ ہوا ماہنامہ ''کتاب'' لاہور کے مدیر ذوالفقار احمد تابش نے گم شدہ کتابوں کی بازیابی کا بیڑہ اٹھایا تھا اور اہلِ ادب کو ایسی کتابوں کا تذکرہ لکھنے پر مائل کیا تھا جنھیں وہ اپنی زندگی میں بھلا نہیں سکے تھے۔ بی بی سی لندن پر ایک پروگرام رضا علی عابدی صاحب نے ''کتابیں میرے آباد کی'' کے عنوان سے شروع کیا تھا جس میں وہ نایاب کتابوں کا تعارف اس خوبصورتی سے کراتے کہ دوسرے روز کتابوں کا اچھا ذوق رکھنے والے اصحاب متعارفہ کتاب حاصل کرنے کے لیے لائبریری میں پہنچ جاتے تھے۔ اس قسم کا ایک اور سلسلہ ذرا بدلے ہوئے انداز میں ذوالفقار احمد تابش نے یوں جاری کیا کہ کتاب دوست مسافر (شخص) ایک تباہ ہونے والے جہاز میں سفر کر رہا ہے اور اپنے سامان میں صرف تین کتابیں لے کر کسی ویران جزیرے میں پناہ لینے پر مجبور ہے۔ تابش صاحب نے سوال کیا: ''اس عالم میں اگر آپ ہوں تو اپنے ساتھ تین کون سی کتابیں رکھنا قبول کریں گے؟'' اردو کے متعدد معروف ادبا نے اپنی پسند کی تین بہترین کتابوں کا تعارف اپنے فطری ذوق کے مطابق کچھ اس دلکش انداز میں کرایا کہ ان کتابوں کو حیاتِ ثانیہ مل گئی اور متعدد اصحاب نے ان کتابوں کے مطالعے سے اپنے ذوق کو منور کیا۔ اس سلسلے میں یہاں لورین ایزلے کی کتاب The Immense Journey کا حوالہ

بالخصوص مناسب ہے کہ اس گم شدہ کتاب کو ڈاکٹر وزیر آغا کے ذوق ادب نے دریافت کیا تھا اور اب تک سیکڑوں باذوق قارئین اس کے مطالعے سے فیض یاب ہو چکے ہیں۔

میں اس طویل تمہید کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ ضرورت اس کی یوں لاحق ہوئی کہ کچھ عرصہ قبل اسلام آباد میں قائداعظم یونی ورسٹی کے انتھروپالوجی کے شعبے میں ایک سیمینار میں شرکت کا اتفاق ہوا تو صدر شعبہ کے کمرے میں اپنا تعارف کرایا تو وہ میرے نام کا جزو ثانی ''سدید'' سن کر چونکے۔ انھوں نے دریافت کیا آپ و، ب، سدید (والدہ تراب علی) کے عزیز ہیں جنھوں نے آزادی سے قبل ایک ناول ''بیاض سحر'' لکھا تھا؟ میں نے گزارش کی کہ یہ ناول میں نے غالباً ۱۹۴۱ء میں پڑھا تھا اور اس کا تاثر اتنا گہرا تھا کہ میں اسے اب تک یاد کرتا ہوں۔ ''بیاضِ سحر'' بیسویں صدی کے پانچویں عشرے میں قومی کتب خانہ (ریلوے روڈ) لاہور نے بڑی تختی پر روشن کتابت اور اجلی طباعت میں بڑے تزک و احتشام سے قریباً ساڑھے چار سو صفحات کی ضخامت میں شائع کیا تھا۔ بعد میں جب مجھے خود لکھنے کا شوق ہوا تو میں نے اپنا نام اس کتاب کی مصنفہ سے ہی اکتساب کیا۔ اس دوران ہی قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی تو مجھے معلوم ہوا کہ لفظ ''سدید'' — اس مصنفہ نے ''قولوا قولاً سدیدا'' کی آیتِ کریمہ سے حاصل کیا تھا۔ میرے نام سے میرے اجنبی دوست پہلے اس مصنفہ تک اور پھر ان کے ناول ''بیاضِ سحر'' تک پہنچے اور پھر دیر تک ہم اس ناول کے بارے میں باتیں کرتے رہے جس کا ذکر ناول کے بیشتر نقاد نہیں کرتے۔

و، ب، سدید اردو ادب کی ایک گمنام مصنفہ ہیں، اتنی گمنام کہ ان کا پورا نام بھی کسی کو معلوم نہیں۔ اور یہ بھی کوئی نہیں جانتا کہ تراب علی جوان کے بیٹے کا نام ہے، کون تھے؟ اور وہ معاشرے میں کس مقام پر فائز تھے۔ بیگم شاہ نواز اور مسز عبدالقادر (والدہ سراج الدین ظفر) وغیرہ کی پہچان تو ان کی معاشرتی حیثیت سے بھی ممکن ہے لیکن و، ب، سدید صاحبہ کو زندہ رہنے کا صرف ایک سہارا حاصل ہے اور وہ ان کی گراں قدر کتاب ''بیاض سحر'' ہے۔ ان کے بارے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ میرے دوست ڈاکٹر رفاقت علی شاہد کو دارالاشاعت پنجاب لاہور کی شائع کردہ کتابوں کے متروک ذخیرے تک رسائی حاصل ہوئی تو ان کی نظر و، ب، سدید کی دو کتابوں پر بھی پڑی جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھی تھیں۔ ایک کتاب پر ان کے گھر کا پتا — ''سعدی پارک، مزنگ لاہور'' بھی لکھا تھا۔ یہ سراغ ملنے پر میں خوشی سے چونک اٹھا اور اسی روز سعدی پارک پہنچا۔ لیکن اس علاقے کے قدیم ترین باسیوں سے بھی محترمہ و، ب، سدید کا اتا پتا نہ ملا۔ عدم معلومات پر افسوس تو ہوا لیکن یہ خوشی بھی ہوئی کہ وہ متعدد کتابوں کی مصنفہ تھیں لیکن انھیں شہرت صرف ''بیاض سحر'' سے ملی۔

''بیاضِ سحر'' کا زمانۂ تصنیف بیسویں صدی کے ربع دوم کا وسطی حصہ ہے۔ اس زمانے میں ادب کے افق پر محترمہ نذر سجاد حیدر (والدہ قرۃ العین حیدر)، محمدی بیگم، صغریٰ ہمایوں، حجاب اسماعیل روشن ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ خواتین اور بالخصوص مسلمان خواتین میں تعلیم حاصل کرنے کا رجحان اگرچہ روبہ ترقی تھا تاہم متوسط طبقے کی خواتین ابھی سماجی قیود میں بری طرح گرفتار تھیں۔ اور تعلیم کی طرف کھلے بندوں راغب ہونے پر چنداں راغب نہیں تھیں۔

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، اور مولانا راشد الخیری کے ناولوں نے خواتین میں بیداری کی ایک نئی لہر تو پیدا کردی تھی تاہم اسے فروغِ عام حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس دور میں نذر سجاد حیدر، اور محمدی بیگم نے عورت کے احساسِ کمتری کو زائل کرنے کی کوشش کی اور نہ صرف ازدواجی مسائل اور معاشرتی قیود کو ناول اور افسانے کا موضوع بنایا بلکہ یہ باور کرانے کی کوشش بھی کی کہ زندگی کی طویل شاہراہ پر عورت مرد کی ہم سفر ہے اور اس کی ذمے داری مرد کی ذمے داریوں سے کم نہیں۔ و، ب، سدید کے ناول ''بیاضِ سحر'' کا موضوع بھی عورت کا معاشرتی کردار اور سماجی منصب ہے اور یہ تقسیم ہند سے قبل کے مخلوط معاشرے کی خوبصورت عکاسی کرتا ہے۔ لیکن اس ناول میں اس دور کی سیاست کا عمل دخل نظر نہیں آتا۔

''بیاضِ سحر'' کا مرکزی کردار روح افزا بیگم نے جس کا پیار کا نام ''فضہ'' ہے۔ یہ ناول فضہ کے بچپن سے جب وہ اپنے خاندان کے تنک مزاج اور بدخو لڑکے نذیر سے منسوب کردی جاتی ہے۔ شروع ہوتا ہے اور زندگی کے طویل اور صبر آزما حالات سے گزار کر اس مقام پر ختم ہو جاتا ہے جب نذیر اپنی بداعمالیوں اور فضہ کے خلاف انتقامی کارروائیوں کی سزا بھگت رہا ہوتا ہے اور مکافاتِ عمل کی گلی میں پھنس جاتا ہے۔ دوسری طرف فضہ بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے، مشکلات کو عبور کر لینے اور نذیر کے پامال حالات سے کشادہ نظری کا سبق لینے کے بعد اپنے آپ کو معاشرے کی اصلاح پر مامور کر چکی ہیں۔

اس لحاظ سے ناول ''بیاضِ سحر'' کا عملی دور قریباً پچیس سال پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ ۲۵ سال فضہ اور نذیر دونوں کی زندگیوں میں بے حد ہنگامہ پرور سال ہیں۔ فضہ فطری طور پر خیر اور معصومیت کا مجسمہ ہے۔ وہ مشرق کی مثبت روایات میں پرورش پانے والی لڑکی ہے جسے تعلیم نے حالات کا تجزیہ کرنے اور مشکلات کا جرات مندی سے سامنا کرنے کی صلاحیت کے علاوہ اپنے فیصلے خود کرنے کا حوصلہ بھی عطا کر رکھا ہے۔ اسے ورثے میں وسیع جائداد ملی تھی۔ اس کا بچپن کا منگیتر نذیر، جس نے تعلیم کو ابتدا میں ہی خیر باد کہہ دیا تھا اور اپنی اَن پڑھ ماں کے بے جا لاڈ پیار اور صحبت بد کی وجہ سے پرلے درجے کا بدقماش اور بدکردار انسان بن گیا تھا۔ فضہ کی جائداد پر قبضہ کرنے کے درپے تھا۔ چناں چہ وہ ابتدا میں خاندانی روابط اور اثر و رسوخ کو استعمال میں لا کر فضہ سے اپنی منگی کو شادی کے مقام تک لانے کی کوشش کرتا ہے لیکن جب وہ اپنے اس منصوبے میں فضہ کے دوٹوک انکار کی وجہ سے ناکام رہتا ہے تو وہ فضہ سے انتقام لینے کے لیے ہر قسم کے مذموم و بے استعمال کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

فضہ ہر چند معصومیت کے گہوارے میں پلی ہوئی لڑکی ہے لیکن اس کے ہاں داخلی خود اعتمادی کی افراط ہے اور جب وہ ایک مرتبہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ وہ نذیر جیسے بدکردار شخص سے شادی نہیں کرے گی تو نہ صرف اس فیصلے پر ثابت قدمی سے قائم رہتی ہے بلکہ نذیر کی پیدا کردہ مشکلات کا مقابلہ بھی کرتی ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن جاتی ہے اور نذیر انتقام کی آگ اپنے سینے میں سلگائے دیارِ غیر میں بھی اس کا پیچھا کرتا ہے تو فضہ اس کا سامنا کرتی اور اپنے پائے ثبات میں لغزش نہیں آنے دیتی اور بالآخر اپنا گوہر مقصود پا لیتی ہے۔ اس وقت نذیر مکافاتِ عمل کی چکی میں پس کر عفو خواہی کا تقاضا کر رہا ہوتا ہے۔

''بیاضِ سحر'' کا یہ اجمال واضح کرتا ہے کہ یہ ایک مقصدی ناول ہے جس میں خیر اور شر ہمہ وقت متصادم رہتے ہیں۔ اس لیے

ناول کا ٹمپو کہیں بھی کمزور نہیں پڑتا۔ فضہ اور نذیر اس ناول کے دو مرکزی کردار ہیں جو فطرت کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس ناول میں حقیقی زندگی کو بڑی فنکاری سے موضوع بنایا گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات متعدد مقامات پر ابھرتے ہیں۔ تحیر پیدا کرتے ہیں اور پھر معنی خیز تاثر ابھار کر ختم ہو جاتے ہیں لیکن اس حقیقت کا اثبات کر دیتے ہیں کہ فضہ تمام تر خیر کی علامت ہے اور نذیر ہمہ تن شر ہے۔ دونوں کا تصادم زندگی کے ہر موڑ پر عمل میں آتا ہے۔ اور مصنفہ نے عصری آگہی کو بس خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سے یہ کردار زندگی کا مرقع نظر آتا ہے۔ ان کرداروں میں زندگی کی لہر ان کی فطرت کے مطابق دوڑتی اور حرکت و عمل کو انگیخت دیتی ہے۔ بالآخر خیر شر پر فتح یاب ہو جاتا ہے تو روح افزا بیگم (فضہ) کی معصومیت قاری کے ذہن و دل پر محیط ہو جاتی ہے اور باور کرنا پڑتا ہے کہ:

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے؟

و، ب، سدید نے ناول ''بیاضِ سحر'' کو جس زمانی پس منظر میں پیش کیا ہے کہ وہ اب ماضی کی آغوش میں گم ہو چکا ہے۔ تاہم اس کی تاریخی حیثیت قائم ہے۔ بلاشبہ ناول کا زمانی تناظر اب دستیاب نہیں لیکن خیر اور شر کی وہ آویزش جسے و، ب، سدید نے کمال خوبی سے ابھارا ہے، کہیں ختم نہ ہونے والی آویزش ہے۔ اس لحاظ سے یہ ناول اب بھی پڑھے جانے اور گہرا تاثر پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور ساٹھ برس قبل کے تاثر میں آج بھی میں شرابور ہوں۔

مطبوعات انجمن ترقی اردو کے لیے لکھے گئے پیش لفظ کا مجموعہ

حرفے چند

جمیل الدین عالی

انجمن کی شائع کردہ کتابوں کے تجزیاتی مقدمے جن سے ۱۹۶۳ء سے تاحال علمی، ادبی اور تحقیقی سرگرمیوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

''حرفے چند'' کی تین جلدیں مطبوعہ ہیں جب کہ چوتھی جلد بھی عنقریب شائع ہونے والی ہے۔

جلد اول: قیمت ۱۰۰ روپے　　جلد دوم: قیمت ۱۲۵ روپے

جلد سوم: قیمت ۱۰۰ روپے　　جلد چہارم: قیمت ۲۵۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

یادوں کی مہک

مصنف: محمد احمد سبزواری/ مرتبہ: ڈاکٹر رضیہ حامد

صفحات: ۳۶۰، قیمت: ۲۵۰ روپے

باب العلم پبلی کیشنز، ۶۰ کنارا اپارٹمنٹ وی آئی پی لیک ویو روڈ، بھوپال (ایم۔پی)، ۴۶۲۰۰۱، انڈیا

ہمارے بزرگ ادیب محمد احمد سبزواری معاشیات اور اردو ادب دونوں شعبوں کے شہسوار ہیں۔ پاکستانی معیشت پر ان کے مضامین ایک موقر اخبار میں مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ ادبی پرچوں میں بھی ان کے مضامین ہمیں پڑھنے کو ملتے رہتے ہیں۔

محمد احمد سبزواری سرزمین بھوپال کے بڑے لائق فرزند ہیں۔ وہ جنوری ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے تھے اس اعتبار سے وہ تقریباً پچانوے برس کے ہو رہے ہیں اور قلم کے ذریعے اپنے جذبات و احساسات کی آبیاری کیے جا رہے ہیں۔ مشفق خواجہ مرحوم انھیں بھوپال پر اتھارٹی تسلیم کیا کرتے تھے۔ سبزواری صاحب اپنی یادداشتیں ہر تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد قلم بند کرتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر رضیہ حامد نے جو ان کی معتقد ہیں ان کے تحریر کردہ مسودے کو ''یادوں کی مہک'' کے عنوان سے ترتیب دیا ہے واضح رہے کہ ڈاکٹر رضیہ حامد کے رسالہ ''فکر و آگہی'' میں بھوپال نمبر کے لیے محمد احمد سبزواری صاحب نے ایک طویل مضمون تحریر کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مقامی زبان و کلچر کے حوالے سے ان کے مزید چار مضامین بھی شاملِ اشاعت تھے۔ ڈاکٹر رضیہ حامد نے اس کے علاوہ بھی اپنی عقیدت کے تحت محمد احمد سبزواری کی تحریروں کو تلاش کر کے محمد احمد سبزواری کی یادداشتوں کا حصہ بنایا ہے۔ ان یادداشتوں میں خودنوشت کا فنی پہلو بھی پوشیدہ ہے۔ اس میں بہت سی شخصیات کے شخصی خاکے بھی ابھر رہے ہیں اور پھر جابجا محمد احمد سبزواری صاحب نے اپنے اور دوسرے علاقوں کے تمدن، ثقافت اور مختلف علوم سے وابستہ شخصیات کے اوصاف کے حوالوں سے اپنے مخصوص جذبات کو بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ بھوپال سے وابستہ ماضی اور حال کے افراد اور دیگر علاقوں سے متعلق قارئین سب کے لیے یہ کتاب جس میں ڈاکٹر رضیہ حامد کا بے پایاں خلوص اور ان کی انتھک ریاضت شامل ہے افادیت کی حامل ہے۔ اسے بھوپال اور محمد احمد سبزواری دونوں کے لیے ایک تحقیقی دستاویز کا درجہ ملنا چاہیے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر اسلم فرخی کی اس رائے کا حوالہ بھی مناسب ہوگا جس میں انھوں نے بجا طور پر لکھا ہے کہ سبزواری صاحب کے ان مضامین سے عبدالحلیم شرر کے ''گزشتہ لکھنؤ'' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ سبزواری صاحب سے بھوپال

چھوٹ گیا، مدتیں ہوگئیں مگر بھوپال کی یادیں آج بھی تروتازہ اور شگفتہ ہیں۔ انھوں نے بھوپال کی ادبی شخصیتوں اور منظرنامے کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ بھوپال کی ثقافتی تاریخ کا مستند سرمایہ ہے۔

یہ کتاب انڈیا سے شائع ہوئی ہے۔ کتنا اچھا ہو اگر اس کا ایڈیشن پاکستان سے شائع کرنے کا بھی اہتمام کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ قارئین تک یہ پہنچ سکے۔

(ڈاکٹر ممتاز احمد خان)

آئینوں کے درمیاں

(منتخب کالموں کا مجموعہ)

رئیس فاطمہ

صفحات: ۳۵۶، قیمت: ۳۰۰ روپے

نو بہار پبلی کیشنز، کراچی

کیا اس کائنات میں کوئی ایسی دنیا ہے جسے ہم اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی دنیا کہہ سکیں؟ فطرت نے انسان کے لیے جو جہاں مقدر کیا ہے وہ اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کا جہان نہیں ہے۔ یہ جہاں اور اس کے جملہ مظاہر نہ صرف یہ کہ ہماری موجودگی سے بے بہرہ ہیں بلکہ بے تعلق بھی ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اتنے منہ زور ہیں کہ ہمارے قابو سے باہر اور گرفت سے آزاد ہیں۔ لاکھ اُپٹھے پر نہیں اٹھتے۔ لے دے کے ایک تخلیقی اپج بچتی ہے وہ بھی سب کو میسر نہیں؛ جو کچھ ایسی دنیا تراش لیتی ہے جہاں فرد کی نارسائیاں اور ناآسودگیاں قدرے دم لے کر سی فس کی دائمی تعذیب میں اپنے حصے کا پتھر لڑھکاتی ہیں۔ رئیس فاطمہ بھی ایک ایسی خلاق فن کار ہے جو فطرت کی موجود کائنات سے نامطمئن اور ناآسودہ رہ کر اپنے افسانوں، کہانیوں، ناولوں اور کالموں کے تنکوں کو جوڑ جوڑ کر ایک گھونسلا بناتی دکھائی دیتی ہے۔ ''آئینوں کے درمیان'' اس کے اخباری کالموں کا منتخب مجموعہ ہے جو روزنامہ ''ایکسپریس'' میں ۲۰۰۱ء سے اب تک وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔

انسان اور آئینہ کے درمیان قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں اپنے اپنے آبجکٹس (Objects) دیکھتے ہیں اور فرق یہ ہے کہ آئینہ اپنے معروض کا عکس جوں کا توں منعکس کر دیتا ہے جب کہ انسان اپنی موضوعیت (Subjectivity) اس میں شامل کر کے معروض کو کچھ کا کچھ بنا دیتا ہے۔ اور پھر زبان کے غیر شفاف ہونے کی وجہ سے Image بھی Torture ہوتا ہے۔ پہلے درجے میں ہم وہ دیکھتے ہیں جو دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ نہیں دیکھ پاتے جو دیکھنا چاہیے اور دوسرے درجے میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ دوسروں کو دکھا نہیں پاتے۔ بنابریں صداقت اپنے صحیح خدوخال کے ساتھ اجاگر ہوئے سے محروم رہتی ہے اسی لیے مابعد جدیدی فکر میں کہا جاتا ہے کہ ہم سب کی اپنی

اپنی صداقتیں ہیں۔ ''محسن کشی ہماری تاریخ!'' کے عنوان سے ایک کالم اس کتاب میں شامل ہے۔ یہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے بارے میں ہے کالم نگار اپنے موقف کی حمایت میں تاریخ کے قبرستان سے اورنگ زیب عالم گیر کو نکال کر لے آئی ہیں۔ اس کالم سے قطع نظر دوسری جانب ایک باخبر صحافی قاضی اختر جونا گڑھی ہیں جو محترمہ رئیس فاطمہ کے شوہر بھی ہیں۔ وہ گورڈن کوریرا کی کتاب "Shopping for Bombs" کے ترجمہ اور تلخیص کار ہیں۔ وہ ڈاکٹر قدیر نیٹ ورک کی ایک بالکل مختلف کہانی سناتے ہیں۔ اسی طرح رئیس فاطمہ جس محمد بن قاسم کو محسن قرار دیتی ہیں اسے اہالیان سندھ کسی اور تناظر میں دیکھتے ہیں تاریخ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ مقتدر کا نقطۂ نظر بیان کرتی ہے۔ اسی لیے پوسٹ کولونیل فکر و تاریخ کو ڈی کنسٹرکٹ کرتی ہے تاکہ حقائق تک پہنچا جاسکے۔ ہر حساس شخص سوچتا ہے مگر ہر سوچنے والا بولتا نہیں ہے۔ رئیس فاطمہ کی حسیت جو کچھ سوچتی ہے وہ اس کا کالموں میں بولتی بھی ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ کسی کے سب بول سونے کی تول ہوں۔

اس انتخاب کو ذیلی سرخیوں مثلاً شعروادب، تعلیم، پاک بھارت دوستی، ڈاکٹر، خواتین کے مسائل اور شہری مسائل کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ یہ سب مل کر جو ایک بڑا منظرنامہ پیش کرتے ہیں اسے ہم ثقافتی اور تہذیبی منظر کہہ سکتے ہیں۔ کالم نویس نے منتخب شعبہ ہائے زندگی سے ہماری ان خامیوں اور کمزوریوں کو نمایاں کیا ہے جو ہماری ثقافتی اور تہذیبی گراوٹ پر منتج ہوتی ہیں۔ کم وبیش تمام اظہاریے لکھنے والے کی اپنی زمین سے محبت اور ثقافتی اقدار سے قربت وراحت کے مظہر ہیں۔ نئی نسل کا اپنے ورثے سے تغافل اور روایات سے انحراف قلم کار کے لیے سوہانِ روح دکھائی دیتا ہے۔ اپنی ثقافتی اور تہذیبی اقدار کی شکست وریخت دیکھ کر اظہاریہ نویس ملول اور کبیدہ خاطر نظر آتا ہے۔

ثقافتیں نہ پہلے کوزہ بند تھیں اور نہ آج سربند بوتلوں میں محفوظ ہیں۔ زندہ ثقافتیں ہمیشہ اپنا چولا بدلتی رہتی ہیں اور یہی ان کی بقا کا راز ہے تہذیبیں اپنے مقامی خدوخال برقرار رکھتی ہیں۔ جب کہ ثقافتیں رنگ بدلتی رہتی ہیں برصغیر کی تاریخ گواہ ہے کہ بھیل اور کول غیر لچک دار روایات کی وجہ سے معدوم ہو گئے۔ دراوڑی کلچر آریائی کلچر کی یلغار سے ہندی کلچر کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ ہندی کلچر پر اسلامی کلچر کی چھاپ نے اس کے خدوخال بدل ڈالے۔ یورپی کلچر نے ہندو مسلم ثقافت کو کولونیل کلچر میں بدل کر رکھ دیا۔ آزادی کے بعد کولونیل مسلسل ری کولونائزڈ ہوتا رہا ہے۔ مارکسی نقاد فریڈرک جیمس ثقافتی تبدیلی کے عمل کو معاشی تبدیلی کے تناظر میں پرکھتا ہے۔ اس کی دانست میں جنیانے (Commodigicatism) کا عمل ثقافت کے بعد آرٹ اور سیاست پر بھی اثرانداز ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی فرد ہو یا معاشرہ جب تک وہ معاشی طور پر آزاد نہ ہو وہ علام ہی رہتا ہے۔ اور غلام اگر اپنے آقا کی زبان بولے تو اس میں تعجب ک کیا بات ہے۔ جب تک ہمارا اجتماعی معاشرتی نظام، بالخصوص اکنامک سسٹم وقت سے ہم آہنگ نہیں ہوگا اور خود کفالتی بنیادوں پر کھڑا نہیں ہوگا رئیس فاطمہ اور دوسرے حساس قلم کار اپنی تہذیب اور ثقافت کا مرثیہ لکھتے رہیں گے۔ ''آئینوں کے درمیاں'' ہمارا تہذیبی نوحہ اور ثقافتی المیہ ہے جسے رئیس فاطمہ نے بڑی بے خوبی کے ساتھ سپردِ قلم کیا ہے۔

(رؤف نیازی)

تیری یاد آتی ہے

زیب النساز یبی

صفحات: ۱۶۰، قیمت: ۱۰۰ روپے

ناصر پبلی کیشنز، اردو بازار، کراچی

زیب النساز یبی کا نام ادبی حلقوں میں تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ کہنہ مشق شاعرہ ہیں وہ گزشتہ دو دہائیوں سے شاعری کر رہی ہیں اور مضامین بھی تحریر کر رہی ہیں۔ ان کے مضامین کے موضوعات سیاست، ادب، سماجیات مذہب اور معاشرت ہیں۔

ان کی شاعری کا مقصد صرف دلبستگی، لفظوں کی خوب صورتی، رومانی پہلوؤں کی عکاسی ہی نہیں بلکہ اس میں ہمہ گیریت، مقصدیت اور زندگی کے تجربات و مشاہدات بھی موجود ہیں:

کیا کیا ادائے شام و سحر دیکھتی رہی
شاہوں کے قصر زیر و زبر دیکھتی رہی

ہم نے پروانوں کی جانوں کو سلامت رکھا
شمع جو طاق میں رکھی تھی جلائی نہیں گئی

پیدا ہر دور میں ہوتے ہیں ستانے والے
محتسب خود ہی طرف دار اگر ہو جائیں

انھوں نے انسانی حقوق کی پامالی، معاشرتی استحصال، نسائی مصائب و تکالیف، بیٹیوں کی پیدائش پر عورتوں کی تذلیل، گھریلو تلخیوں، عورت کی بدحالی، اس کی کم تر سماجی حیثیت اور تباہی و بربادی، مرد و زن کے تعلقات خیر و شر کے معاملات پر کو اپنی شاعری میں خوبی سے اجاگر کیا ہے:

میں ہوں خود تماشائے نظر
دیکھنے والے نہیں، دنیا میں غم خانے بہت

ہر روز دیکھتی ہیں تماشائے کائنات
کیسی قماش بیں ہیں یہ آنکھوں کی پتلیاں

مجموعی طور پر زیب النساز یبی نے ہمارے سماجی مسائل کی بڑی خوبیوں کے ساتھ عکاسی کی ہے جس پر وہ مبارک باد کی مستحق ہیں۔

(آغا نور محمد پٹھان)

بارِ خدا (ناول)

محمد امین الدین

صفحات: ۱۷۶، قیمت: ؟؟؟ روپے

E-135/2B بلاک 7، گلشن اقبال، کراچی

۸/اکتوبر کا زلزلہ ہماری قومی تاریخ کا ایک بہت بڑا المیہ ہے جس کے اَن مٹ نقوش ان لاکھوں لوگوں کی زندگی مرتسم ہوئے جو اس قیامت صغریٰ سے گزرے۔ ادیب معاشرہ کا حساس فرد ہوتا ہے اور ادب معاشرہ کا عکاس لہٰذا ادب اور ادیب اس جانکاہ حادثے سے کیسے بے نیاز رہ سکتا ہے محمد امین الدین کے ناول ''بارِ خدا'' کا موضوع کشمیر اور شمالی علاقوں میں ظہور پذیر ہونے والا حادثہ ہے۔

کہانی شروع تو ڈاکٹر محبّ اور ڈاکٹر نوشین کے شمالی علاقوں کی سیر کے سفر سے ہوتی ہے جو کراچی سے اسلام آباد ریٹائرڈ میجر نہال احمد کے پاس جاتے ہیں جو ڈاکٹر محبّ کے والد کے بچپن کے دوست ہیں۔ یہاں میجر صاحب کی بیوہ بیٹی بھی اپنے دو معصوم بچوں حرا اور طلال کے ہمراہ رہتی ہے۔ سفر کے شروع ہی میں جہاز میں سوار ہونے والے مسافروں کی قطار میں کھڑا ایک خوبصورت جوڑا ان کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے اور وہی نو بیاہتا جوڑا ان کو کیپٹن زبیر کے گھر پر خوش آمدید کہتا ہے۔ یہ عزیز اور اریبہ ہیں، عزیز کیپٹن زبیر کا چھوٹا بھائی ہے جو اپنی دلہن اریبہ کے ساتھ ہنی مون منانے بڑے بھائی کے ہاں مظفر آباد آیا ہوا ہے۔

اگرچہ یہ سب جن میں میجر صاحب کی بیٹی نفیسہ اور اکیلے دونوں بچے بھی شامل ہیں ہنی موٹ، ایڈونچر، سیر و تفریح کے لیے کشمیر آئے تھے مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا وہ لوگ کیپٹن زبیر کے خادم بابا شیر دل کی پوتیوں کی روزہ کشائی میں شاداں و فرماں ہوتے ہیں کہ آن کی آن میں دل ہلا دینے والی آوازیں نہ قابل بیاں تباہی اور بربادی مچا دیتی ہیں، پتھر گرنے لگتے ہیں دیواریں چٹخنے لگتی ہیں، چھتیں اور مچان زمین بوس ہو جاتے ہیں، شیشے چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ زلزلہ قیامت بپا کر جاتا ہے۔ ہر گھر ماتم کدہ بن جاتا ہے۔ ہر شخص کی دنیا زیر و زبر ہو جاتی ہے، ہر فرد و بشر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے کہیں پورے کے پورے گھر اجڑ جاتے ہیں اور کوئی کاندھا دینے والا نہیں ہوتا دوسروں کے ہاں زخمیوں کی قطاریں ہوتی ہیں اور طبی سہولت ناپید غم سب کا مشترک تھا مگر قدرے مختلف بھی۔ اس نفسا نفسی کے عالم میں سعید روحوں کے ایثار و قربانی کے وہ مناظر دیکھنے میں آتے ہیں کہ شرافت اور انسانیت پر یقین مستحکم ہوتا ہے۔

بابا شیر دل کے بیٹے کے دل میں خیال آتا ہے کہ وہ گھر لوٹ چلے مگر وہ اس خیال کو جھٹک دیتا ہے، نہیں یہاں میرے بچے ہیں، دوسرے لمحے اسے اپنے بھائی کے بچوں کا خیال آتا ہے اور پھر اس وقت گھر میں موجود دوسروں بچوں کا جو اسے کسی طرح کم پیارے نہیں تھے۔ تعلیم کے فروغ کے لیے اپنے کیریر کو پس پشت ڈالنے والا ریاض جس نے علاقے میں ایک اسکول قیام کر رکھا تھا جب اپنے اسکول کے طالب علموں کی لاشوں کو دیکھتا تو علم و آگہی کے ان بجھے چراغوں کو دیکھ کر اس کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ اس وقت ریاض اپنے آپ کو سیکڑوں بچوں کا لٹا پٹا استاد اور برباد روحانی باپ محسوس کرتا ہے۔ جسے زلزلے کی دو دھاری تلوار نے کاٹ کر ہزاروں ٹکڑوں میں

بانٹ دیا تھا۔ مگر درد سہنے کے لیے وہ پھر بھی زندہ تھا تاہم ناول کی حزنیہ فضا اس وقت متبسم ہوتی ہے جب زخمی نفیسہ، جن کا بیٹا طلال عزیز اور اریبہ کی طرح جان سے ہاتھ چھو چکا ہے پر یہ عقدہ کھلتا ہے کہ کیپٹن زبیر اس کے نہاں خانہ دل میں کیوں اترا ہوا ہے۔ نفیسہ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں جب زبیر اس کو بتاتا ہے:

''برسوں پہلے کی بات ہے ایک ایس پی صبح جب سیلاب کے پانی میں کچھ فوجی ایک سیکنڈ لیفٹننٹ کی سربراہی میں کالج کی چند لڑکیوں کو بچانے پہنچے تھے وہاں سیکنڈ لیفٹننٹ کو ایک لڑکی سے اچانک محبت ہوگئی تھی۔ وہ سیکنڈ لیفٹننٹ آج بھی اس لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ اور اسے اپنے گھر کی کیپٹن بنانا چاہتا ہے۔''

نفیسہ کو یاد آیا کہ برسوں پہلے وہ اپنی کالج کی دوستوں کے ساتھ پنجاب انٹر کالجیٹ کرکٹ ٹورنامنٹ میں شرکت کے لیے جہلم گئی تھی جہاں سے وہ اپنی تمام دوستوں سمیت ٹیم میٹ عذرا مختار کی والدہ سے ملنے اس کے گاؤں گئی تھی جہاں سیلاب نے ان کو آلیا تھا اور پھر فوجی جوانوں کی ایک ٹیم جس کی قیادت سیکنڈ لیفٹننٹ زبیر کر رہا تھا لائف بوٹس کے ذریعے ان کو بچایا تھا بعد میں اس کی شادی ہوگئی تھی اور وہ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی کہ اس کے شوہر کو دشمنوں نے گولی ماردی۔ وہ دوسری شادی سے گریزاں تھی جب کہ اس کے والدین اس کا گھر بسانا چاہتے تھے۔ زبیر جو پہلی ہی نظر میں اس کو دل دے بیٹھا تھا اس کی ویران زندگی میں اب بہار آ گئی تھی اس طرح ڈاکٹر محبّ اور نوشین جن کے سپرد میجر نہال نفیسہ کو لیفٹننٹ نہال سے ملانے کا مشن سپرد کیا تھا پورا ہو جاتا ہے۔

ناول نگار محمد امین الدین جن کے اس سے پہلے افسانوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں ناول میں جنت ارضی کشمیر کے حسین مناظر کی خوبصورت منظر کشی کی ہے۔ ناول کی نثر رواں دواں ہے اور اس میں بعض جملے بڑے کاٹ دار ہیں۔

اس ناول کو ایک نشست میں پڑھا جاسکتا ہے۔

(محمود العزیز)

تماشا

تسنیم عابدی

صفحات: ۱۸۴، قیمت: ۲۵۰ روپے

ادارہ سخنور، بی ۶، سادات امروہہ سوسائٹی سیکٹر ۳۷، کراچی

تماشا کی تقریبِ پذیرائی میں میری ملاقات نقوش نقوی صاحب کے توسط سے تسنیم عابدی صاحبہ سے ہوئی۔ مجھے وہ انتہائی خوش مزاج، ملنسار اور صاف گو، میٹھے اور دھیمے لہجے کی خاتون نظر آئیں۔ شخصیت اور شاعری میں ایک ایسا رشتہ ہوتا ہے جس کا پرتو اور عکس اس کی شاعری میں کہیں نہ کہیں ضرور نظر آتا ہے اور وہیں سے اس کی پہچان کا عمل شروع ہو جاتا ہے اگر کوئی شعر ادبی معیاروں پر پورا اترتا

ہے تو ہم اسے شاعری کے دائرے میں داخل کر سکتے ہیں۔ عقل، جذبہ، حسیات، لاشعور وغیرہ عناصر کو سامنے رکھ کر الگ الگ شعری نظریے تخلیق کیے گئے ہیں اگر ان تمام نظریات کا تجزیہ کیا جائے اور ان کا تماشا دیکھنا ہو تو اس وقت تسنیم عابدی کی شعری تخلیق ''تماشا'' ہمارے سامنے ہے۔ جس کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری مختلف اقسام کے رنگوں سے مزین ہونے کے باوجود اپنا علاحدہ ایک ایسا رنگ رکھتی ہے جو ہر رنگ سے جدا اور انوکھا ہے جو تمام تنگوں میں اپنی الگ پہچان رکھتا ہے، ان کی شاعری میں تشبیہ اور استعاروں کے ساتھ ساتھ امیجری بھی ملتی ہے انھوں نے نئی نئی اصطلاحات کو اردو ادب و شاعری میں متعارف کرانے کا شرف حاصل کیا ہے انھوں نے اپنے خوشگوار اور ناخوشگوار تجربات سے بھی اپنی شاعری کو روشناس کرایا ہے اور اپنے شعری سفر کو نیا آہنگ بخشا ہے۔ انھوں نے اپنے اندازِ بیاں میں شیرینی، رچاؤ، نرم و رواں زبان، سبک الفاظ سے شعروں میں رنگ بھرا ہے اور ہر رنگ کو توانائی، قوت، روشنی اور ذات کی تکمیل کے لیے استعمال کیا ہے۔ تسنیم عابدی کی شاعری احساس کی شاعری ہے جس میں انفرادی تجربات کے علاوہ قومی اور اجتماعی واقعات کی ترجمانی بھی ملتی ہے جو انھیں ایک نہایت اہم اور مستحکم شاعرہ ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے:

چشمِ احساس سے ٹپکا ہوا آنسو میں ہوں
تو ہے گر پھول تو پھر پھول کی خوشبو میں ہوں

عمر رشتوں کے تقاضے ہی نبھاتے گزری
زندگی نے مجھے اپنا کبھی ہونے نہ دیا

راز کا بزم میں چرچا کبھی ہونے نہ دیا
ہم نے اپنے کو تماشا کبھی ہونے نہ دیا

تسنیم عابدی کی شاعری میں ان کی شخصیت کے رنگ جگہ جگہ بکھرے نظر آتے ہیں وہ اپنے جذبات اور محسوسات کو لطیف پیرائے اور ہلکے پھلکے انداز سے اپنے اشعار میں منتقل کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ وہ نئے تجربات کو انوکھے پیرائے میں دنیا سے متعارف کراتی ہیں اور یہی خوبی انھیں دوسری شاعرات سے منفرد و ممتاز بناتی ہے:

اُسے میں اُس کی طرح سے جواب دے نہ سکی
مرے مزاج سے شائستگی نہیں جاتی

ہے گھر داری مری فطرت میں لیکن
مرا اپنا کوئی بھی گھر نہیں ہے

میرے لیے سزا یہی تجویز کی گئی
زندہ رکھا گیا مجھے مارا نہیں گیا

تم کو ہم سے رہا گلہ لیکن
اپنے طرزِ سخن پہ غور کیا؟

تصفیہ گھر کا گھر میں رہنے دیں
بات پھیلے گی کو بہ کو صاحب

مذکورہ بالا اشعار Man Dominated معاشرے کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ تسنیم عابدی نے انتہائی سچائی اور خوبصورتی سے پیش کر کے شعر و ادب کی تاریخ میں اضافہ کیا ہے تسنیم عابدی نے اپنے عہد کے تقاضوں، علامتوں اور ذہنی رویوں کا بھرپور خیال رکھا ہے ان کی شاعری میں نئے حوصلے اور نئے آہنگ کی دھڑکنیں گونج رہیں ہیں جو قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں:

جھیل میں بس ایک پتھر پھینک کر
دائرے کی گونج میں سنتی رہی

انھوں نے اپنے دکھوں کو کہیں آپ بیتی اور کہیں جگ بیتی کے انداز میں پیش کیا ہے ان کی شاعری کو سچی شاعری کہا جا سکتا ہے۔ ان کے اشعار ان کی زندگی کے نشیب و فراز کے آئینہ دار معلوم ہوتے ہیں جو درد و غم کی عکاسی لگتے ہیں۔

تسنیم عابدی نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو اپنی شاعری میں اس طرح پیش کیا ہے کہ قارئین داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے وہ آج کی نمائندہ شاعرات میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ مجھے ان کی شاعری جن میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں جس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کا عزم اور حوصلہ ہے:

تماشے میں پسِ پردہ سبھی کردار بے بس تھے
سحر کاری تھی ساری ہم اداکاری نہ کرتے تھے

(خمار فاروقی)

اٹک، راولپنڈی اور ہری پور کے چند کتب خانوں کے اہم خطی نسخے

سفیر اختر

صفحات: ۱۴۰، قیمت: درج نہیں

دارالمعارف، لوہسر شرفو، واہ کینٹ

جب انسان نے نقوش یا تصویر نما خاکوں سے اپنے خیالات کو منتقل کرنے کا ذریعہ بنایا تب ہی سے کتب خانوں کا آغاز ہوا۔ گو اس دور کے کتب خانے آج سے بالکل مختلف تھے۔ سمیری، بابلی، کمدانی اور آشوری اقوام کے کتب خانوں کا پتہ چلتا ہے جو مٹی کی تختیوں پر مشتمل ہوتے تھے، خود اسرائیلی روایت کے مطابق توریت کے دس احکام پتھر کی سلوں پر موصول ہوئے تھے بعد میں مصر میں پیپرس سے کاغذ بنایا جانے لگا اور رسم الخط بھی ایجاد ہو گیا۔ اسکندریہ کا کتب خانہ بہت مشہور ہے جس کو جولیس سیزر کے سپاہیوں نے ۴۷ قبل مسیح میں دانستہ یا نادانستہ جلا دیا تھا۔ بعد میں مسیحی اقوام نے اس کا الزام حضرت عمرؓ کو دیا کہ مصر کے گورنر عمرو بن العاص نے خلیفہ کے حکم پر اس کو جلایا تھا۔

یونان میں ارسطو کا کتب خانہ مشہور تھا، بنو عباس کے عہد میں ہارون الرشید نے بیت الحکمۃ کی بنیاد رکھی، جس کو مامون نے مزید وسعت دی، اس زمانے میں کاتب کتابوں کی نقلیں کیا کرتے تھے اور یہاں ہزاروں کاتب یہ کام کرتے تھے تاتاریوں نے جب بغداد پر حملہ کیا تو اس کو جلا دیا۔ قدیم بھارت میں گرنتھ کٹی، پستک استھان، سرسوتی بھنڈار کے ناموں سے کتب خانوں کا پتہ چلتا ہے جن میں تال پتر، تاڑ کھلا اور کنول کے پتوں پر لکھی ہوئی کتابیں موجود تھیں۔ مغلیہ دور میں اکبر (یہ پڑھا لکھا تھا) جہانگیر اور اورنگ زیب کے زمانے میں شاہی کتب خانے قائم تھے۔ ٹیپو سلطان کا کتب خانہ مشہور تھا جو اس کی شہادت کے بعد برٹش میوزیم میں منتقل ہو گیا۔ پرائیوٹ کتب خانوں میں حیدرآباد کے سر سالار جنگ، انجمن ترقی اردو (جو ۴۷ میں لوٹ لیا گیا) اور بانکی پور پٹنہ کا خدا بخش کے کتب خانوں کی اہمیت تھی۔

پاکستان میں اس وقت پنجاب یونی ورسٹی کا کتب خانہ سب سے بڑا ہے جس کو دہلی کالج کا کتب خانہ بھی مل گیا تھا۔ کراچی میں بیت الحکمت بڑی منظم لائبریری ہے۔ لیاقت نیشنل لائبریری اور فریر ہال کا کتب خانہ بدنظمی اور آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی لائبریری مالی مشکلات کا شکار ہے۔ دو پرائیوٹ کتب خانے کے بانیوں کی رحلت کے بعد لاہور منتقل ہو گئے۔ مرزا ظفر الحسن کی قائم کردہ غالب لائبریری قدیم و جدید رسالوں اور جرائد کی بہترین لائبریری ہے۔

اس طویل تمہید کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ اچھے کتب خانوں کے بغیر انسانیت ترقی نہیں کر سکتی۔ بدقسمتی سے ہماری حکومتیں اس فرض سے غافل ہیں۔ ایسی صورت میں کوئی انفرادی کوشش جو اس پہلو کو ابھارتی ہو قوم کے شکریہ کی مستحق ہے۔ پنجاب ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں کی زد میں رہا۔ مگر علمائے کرام کی وساطت سے یہاں علم کی شمعیں روشن ہوتی رہیں اور لاہور اور ملتان علم و فضل کے مرکز بنے، مگر

خواص کیا عوام بھی اندرونی پنجاب کی علمی خدمات سے ناواقف رہے۔ سفیر اختر صاحب کی زیر تبصرہ کتاب سے ان بستیوں کا پتہ چلتا ہے جن کے ناموں سے قرب و جوار تک کے لوگ واقف نہیں۔ موصوف نے نہ صرف ان کتب خانوں کا پتہ چلایا بلکہ ان کے اہم ترین خطی نسخوں کی تفصیلات جمع کیں، پرانے نسخوں کی تلاش اور ان کا مطالعہ کر کے ان کے کوائف کو یکجا کرنا بڑا پتہ مار کام ہے اس کے لیے لگن اور بے لوث دھن کی ضرورت ہے۔ ان مخطوطات کا دورانیہ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری تک پھیلا ہوا ہے۔ بعض نسخے جیسے ''المحیط البرہانی فی الفقہ النعمانی'' کا مخطوطہ تین ہزار صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ گو یہ مخطوطات زیادہ تر عربی اور فارسی میں ہیں اور مذہبی امور فقہ سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ اب ہمارے یہاں عربی اور فارسی داں خال ہی خال نظر آتے ہیں پھر قدیم رسم الخط کو پڑھنا بھی ہمارے اردو کے فاضلوں کے لیے چیستاں سے کم نہیں۔ دراصل یہ ہے وہ کام جس کو تحقیق کہا جا سکتا ہے اور ایسے علمی کاموں پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی اسناد اور ڈگریاں ملنی چاہیے۔ ہمارے محققین نے ماضی قریب کے رسالوں اور جرائد سے افسانوں، مضامین اور اداریوں کو فائلوں سے جمع کر کے اعلیٰ اسناد حاصل کرنے کا ایک آسان نسخہ تلاش کر لیا ہے۔ اس پس منظر میں سفیر اختر صاحب کی علمی مساعی لائق تحسین ہے جنھوں نے علم کے حقیقی متلاشیوں کے لیے بیش بہا مواد فراہم کر دیا ہے۔ میں انھیں اس علمی کارنامے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

(محمد احمد سبزواری)

اصل مسئلہ معاشی ہے

سید محمد فاروق القادری

صفحات: ۱۸۰، قیمت: ۲۵۰ روپے

ادارہ پاکستان شناسی، ۲/۲۴، سوڈھیوال کالونی، ملتان روڈ، لاہور

سید محمد فاروق القادری ایک ایسے اسکالر ہیں جنھوں نے اسلام کا بالاستعیاب مطالعہ کر کے ایک نظریہ قائم کیا ہے کہ انسان کے معاشی مسائل کو نظر انداز کر کے حقیقی اسلامی نظام کا نفاذ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام محض نماز اور روزے ہی کا نام نہیں بلکہ۔ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جس میں انسان کی معاشی ضروریات کا بھی خیال رکھا گیا ہے اور ان تمام سماجی و معاشرتی برائیوں کا سدباب کیا گیا ہے جو ایک فلاحی نظام کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ ان میں جاگیرداری اور سرمایہ داری کو بڑی برائیوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال کے اشعار کا بھی سہارا لیا گیا ہے اور آنحضرت محمدؐ کے اس فرمان کا بھی حوالہ دیا گیا ہے جس میں افلاس کو کفر کا پیش خیمہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں جن نکات کو زیر بحث لا کر معاشی مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ وسائل رزق پر چند افراد کے تسلط کے خراب نتائج

۲۔ معاشی استحصال مذہبی جبر اور اخلاقی پستی کی وجوہات

۳۔ معاشی مسئلے کے حوالے سے اسلام کی انقلابی تعلیمات

۴۔ عہد ملوکیت اور ملوکیت کے نقصانات

۵۔ عہد حاضر کا انسان معاشی مسائل کے سدباب کے لیے کتاب وسنت سے کس طرح رہنمائی حاصل کرسکتا ہے وغیرہ وغیرہ

سید محمد فاروق القادری نے عرق ریزی اور گہرائی کے ساتھ ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہے ان نظریات کا بطلان کیا ہے جن سے اسلام کے بارے میں منفی تاثر پیدا ہوتا ہے جب کہ ایسا نہیں ہے۔ وہ آنحضرت محمدؐ کی حیات مبارکہ خلفائے راشدین کی زندگی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی طرز حیات، صوفیائے کرام کے طرز عمل کو زیر بحث لاتے ہوئے یہ ثابت کرتے ہیں کہ انسان کے حقیقی و جائز معاشی مفادات کے تحفظ سے ملک وقوم کو زبردست سیاسی، معاشرتی، سماجی، علمی، تہذیبی اور اخلاقی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنا وہ خط بھی شائع کیا ہے جو انھوں نے عبدالستار نیازی مرحوم کو بغرض رہنمائی تحریر کیا تھا۔ اس مقالے کی خاص بات ان وجوہات کا مدلّل ومبسوط بیان ہے جنھوں نے ہمارے سیاسی و مذہبی پارٹیوں اور تعلیمی اداروں کو اس راہ سے دور کر دیا ہے جو عظیم انسانی فلاح کی جانب لے جاتی ہے۔ مصنف نہ تو سوشلزم کے حامی ہیں اور نہ سرمایہ دارانہ نظام حکومت کے۔ وہ کتاب وسنت کے حوالے سے بات کرکے یہ ثابت کرتے نظر آتے ہیں کہ کتاب وسنت ہی میں ہمارے معاشی مسائل کا حال موجود ہے۔

(م۔ا۔خ)

جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری

ڈاکٹر ناہید قاسمی

اردو میں فطرت نگاری کے حوالے سے ایک مربوط مقالہ ہی نہیں بلکہ اردو شاعری پر یہ ایک اہم کتاب بھی ہے۔

قیمت: ۴۰۰ روپے

گردوپیش

وفاقی اردو یونی ورسٹی میں مرزا قلیچ بیگ سیمینار

شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ کو بابائے سندھی ادب کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کی زندگی علم اور ادب کے فروغ میں گزری انھوں نے سندھی ادب کو بہت قیمتی اثاثہ دیا ہے، یہ بات ممتاز استاد و دانشور ڈاکٹر نواز علی شوق نے وفاقی اردو یونی ورسٹی کے شعبہ سندھی کی طرف سے منعقدہ سیمینار میں کہی، انھوں نے کہا کہ سندھی ادب برصغیر پاک و ہند کا بھی اہم اثاثہ ہے۔

اس تقریب میں ڈاکٹر خورشید عباسی نے اپنے مقالے میں مرزا قلیچ بیگ کی علمی اور ادبی کاوشوں کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ سندھی ادب کا بڑا نام ہے اور ان کے ذکر کے بغیر سندھی ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

سیمینار کے مہمان خصوصی ایرانی قونصل جنرل ڈاکٹر مہدی علی توسلی نے مرزا قلیچ بیگ کی علمی خدمات کو سراہتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ خانہ فرہنگ ان کی غیر مطبوعہ کتابوں کی اشاعت کا بندوبست کرے گا۔

نصیر مرزا نے اپنے مضمون میں کہا کہ قلیچ بیگ کی شخصیت سندھ کے لیے باعث فخر ہے نیز یہ کہ ان کی علمی کاوشوں پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

پروفیسر سیما ابڑو نے اپنے مقالے میں کہا کہ سندھی ادب انسانیت کے فروغ اور امن کا داعی ہے انھوں نے مزید کہا کہ آج سندھی ادب کے شہہ پاروں کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کی ضرورت ہے۔

مرزا اعجاز بیگ نے اپنی تقریر میں کہا کہ مرزا قلیچ بیگ نے ساڑھے چار سو سے زائد کتابیں لکھی ہیں مگر سندھ یونی ورسٹی تک نے ان کی چیئر قائم نہیں کی۔

سیمینار سے پروفیسر رعنا ہلال، ڈاکٹر وسیم الدین، ریاض احمد شیراز نے بھی خطاب کیا۔ صدر شعبہ ڈاکٹر عنایت حسین لغاری نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا، نظامت کے فرائض ڈاکٹر عبدالغفور بلوچ نے ادا کیے۔ سیمینار کے اختتام پر کلیہ فنون میں ایرانی قونصل جنرل نے مرزا قلیچ بیگ لائبریری کا افتتاح کیا۔ سیمینار میں اساتذہ، طلبہ اور عمائدین شہر کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

(رپورٹ: محمد عباس حیدر)

شعبہ اردو سندھ یونی ورسٹی میں سیمینار لیکچرس

گزشتہ ماہ شعبہ اردو سندھ یونی ورسٹی کے زیر اہتمام دو سیمینار لیکچرس کا اہتمام کیا گیا۔ پہلے لیکچر کا جس کے نگراں ڈاکٹر سید جاوید اقبال (صدر شعبہ اردو) اور مقالہ نگار عبداللطیف انصاری تھے عنوان تھا ''اردو خطبے کے آغاز وارتقا کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' (ابتدا سے عہد سرسید تک) یہ لیکچر برائے ایم فل اردو تھا۔ اس کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو، ڈین فیکلٹی آف آرٹس نے کی۔

دوسرا لیکچر بھی برائے ایم فل اردو تھا۔ مقالہ نگار ذوالفقار علی تھے۔ نگراں حسب سابق پروفیسر ڈاکٹر سید جاوید اقبال تھے۔ اس سیمینار کی صدارت بھی پروفیسر ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو ڈین فیکلٹی آف آرٹس نے فرمائی۔ لیکچر کا عنوان تھا۔ ''سندھ کی خانقاہوں میں نثری ادب کا آغاز وارتقا'' (تحقیقی وتنقیدی مطالعہ) شعبہ اردو کے یہ پروگرام کامیابی سے منعقد کیے گئے جن سے جامعاتی سطح کے طالب علموں کی علمی وتحقیقی رہنمائی ہوئی۔

(رپورٹ: ادارہ)

ادبی تنظیم ''سخن دوستاں'' کا قیام

مورخہ ۲۲ ستمبر ۲۰۰۷ء شہر کراچی کے سرکردہ ادبا وشعرا کا ایک اجلاس سہیل اختر ہاشمی کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا۔ جس میں متفقہ رائے سے طے ہوا کہ ادبی سرگرمیوں کو معتبر اور مستند طریقۂ کار کے مطابق فروغ دینے کے لیے ایک ادبی تنظیم کا قیام عمل میں لایا جائے۔ کثرتِ رائے سے مجوزہ تنظیم کا نام ''سخن دوستاں'' تجویز کیا گیا اور باہمی مشاورت سے مندرجہ ذیل افراد کو ذمہ داریاں تفویض کی گئیں۔

مزید براں یہ بھی طے پایا کہ ''سخن دوستاں'' کی سرگرمیوں اور شہر میں ادب کے فروغ کے لیے سہ ماہی بنیاد پر ایک مجلّہ بھی شائع کیا جائے۔ مجلّہ کا نام ''صحیفۂ سخن'' تجویز کیا گیا جسے کثرتِ رائے سے منظور کرلیا گیا۔ تنظیم کے رفقا کار کے لیے مندرجہ ذیل افراد کو منتخب کیا گیا۔

سرپرست حضرات	:	محترم پروفیسر آفاق صدیقی، محترم نصیر کوٹی، محترم کاوش عمر صاحب، محترم الیاس شاداں
صدر	:	محترم لیاقت علی عاصم
نائب صدور	:	محترم سعید آغا، سہیل اختر ہاشمی
معتمد عمومی	:	م۔م۔ مغل
شریکِ معتمد عمومی وخازن:		سید انور جاوید ہاشمی
معتمد نشر واشاعت	:	حامد علی سید
معتمد تقریبات	:	اختر علی انجم

مجلس مشاورت : محسن اسرار، عبیدالرحمٰن، محبوب حسین محبوب، فیض عالم بابر، سجاد ہاشمی، احسان الحق، قیصر منور، احتشام انور، خیام قادری، افضل شاہ، محمد احمد، عدنان عکس۔

(رپورٹ: انور جاوید ہاشمی)

ادبی خطوط کی اہمیت پر ڈاکٹر خلیق انجم کی گفتگو

معروف اخبار ''انڈین ایکسپریس'' سے گفتگو کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو (ہند) کے سیکریٹری جنرل ڈاکٹر خلیق انجم نے فرمایا کہ ہماری ریسرچ میں ادبی خطوط کے بغیر تحقیق کا کام مکمل نہیں ہوسکتا۔ خط کے ذریعے جو حقائق سامنے آتے ہیں وہ حیرت انگیز ہوتے ہیں۔ ان خطوط کے ذریعے جہاں ایک طرف مصنف کے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حالات کا اندازہ ہوتا ہے وہیں دوسری طرف خود مصنف اور ان کے خاندان کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ پندرہ سال کی مدت میں اب تک قریب پونے تین لاکھ خطوط انجمن ترقی اردو ہند کے دفتر میں جمع کیے جاچکے ہیں جن کو ترتیب دینے کے لیے قریب تین ہزار فائلیں تیار کی گئی ہیں اور جس کے لیے ہاشم رشیدی اور امیر الحسن اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہر خط کے دو کارڈ بنائے جاتے ہیں۔ ایک کارڈ جس کے نام خط ہوتے ہیں اور دوسرا وہ کہ جس کے خط ہوتے ہیں۔ ہر خط پر حوالے کے نمبر تحریر کرتے ہیں، مثلاً خطِ اعجاز حسین بنام مظفر حنفی، تاریخ ۹/اگست ۱۹۷۳ء، حوالہ نمبر ۱۴ اور فائل نمبر ۳۱۸ اور ایک سلیپ لگا کر ایک پولی تھین میں رکھ دیتے ہیں۔ ایک ہی نام کے خطوط کو ایک فائل میں لگا دیتے ہیں اور کارڈ کے مطابق دو طرح کے کیبنٹ بھی ہیں تاکہ تلاش کرنے میں آسانی ہو، یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی خط تلاش کرنے میں آدھا منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگتا۔ انھوں نے بتایا کہ میں پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ پاک و ہند کی کسی لائبریری میں اتنے مشاہیر کے خطوط اور اس انداز سے نہیں جمع کیے گئے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے دو طرح کے خطوط دکھائے قدیم اور جدید۔ قدیم خطوط میں مرزا اسد اللہ خاں غالب، علامہ اقبال، مولانا شبلی، عبدالحلیم شرر، چکبست، پریم چند وغیرہ کے نام ہیں جب کہ نئے لوگوں میں شامل ڈاکٹر خورشید جہاں، کرشن چندر، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، قرۃ العین حیدر، پروفیسر نثار احمد فاروقی، قاضی عبدالودود، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر اعجاز حسین، پروفیسر خواجہ احمد فاورقی، آل احمد سرور، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر خلیق انجم، خواجہ حسن ثانی نظامی، پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر سید عابد حسین وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ پاکستان سے ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر جمیل الدین عالی، مشفق خواجہ، منیر نیازی، وحید قریشی، محمد طفیل، ڈاکٹر معین الرحمٰن وغیرہ کے علاوہ کئی اور لوگوں کے خطوط موجود ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ جب میں غالب کے خطوط پر کام کر رہا تھا تو خطوط کو پڑھتے ہوئے یہ خیال آیا کہ اگر غالب کے خطوط نہ ہوتے تو غالب کی کوئی مکمل سوانح عمری نہیں لکھی جاسکتی تھی۔ غالب کی سوانح عمری کا بہت بڑا حصہ ان کے خطوط سے لیا گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ جب ہم نے پہلی بار ہفت روزہ ''ہماری زبان'' میں اشتہار دیا تو سب سے پہلے خطوط کا کلیکشن پروفیسر نثار احمد فاروقی کا آیا جو ڈیڑھ ہزار خطوط پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد لوگوں کے خطوط آتے گئے جس سے ہمارا حوصلہ بڑھتا گیا اور یہ سلسلہ آج بھی

جاری ہے۔ انھوں نے بتایا کہ نئی بستیوں سے سید عاشور کاظمی (برمنگھم)، اقبال مرزا (لندن)، اسد مفتی (ہالینڈ)، شاہین (کناڈا)، لدمیلا واسیلیوا (روس) وغیرہ کے خطوط ہیں جو نہایت قیمتی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اب تک قریب ۱۰۰ ریسرچ اسکالروں نے ان خطوط کے ذریعے اپنا تحقیقی کام انجام دیا ہے۔ جن میں قریب پندرہ ریسرچ اسکالر بیرونی ممالک کے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہم بہت جلد ان خطوط کی نمائش کرنے والے ہیں۔ یہ خطوط آنے والی نسلوں کے لیے نہایت بیش قیمتی ہیں۔

(رپورٹ: ادارہ)

تابش دہلوی — یادگاری جلسہ

برصغیر کے ممتاز شاعر، ادیب اور براڈ کاسٹر تابش دہلوی ایک طویل عرصے تک ادبی افق پر چھائے رہے۔ گزشتہ دنوں ان کی تیسری برسی کا اہتمام آرٹس کونسل آف پاکستان میں لیا گیا۔ ان کے صاحبزادے سعود تابش نے ان کی شخصیت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ایک انتہائی شفیق باپ، بڑے شائستہ اور مہذب انسان تھے۔ انھوں نے ان کی یادوں کو اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے عظیم سرمایہ قرار دیا۔ شاعرہ شاہدہ حسن نے ان کی ذات کو روشن اور تابناک قرار دیتے ہوئے ان کی علمی عظمت کو سراہا اور بتایا کہ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ استاد بھی تھے جن سے دوسرے بہت کچھ سیکھتے تھے مثلاً صحیح تلفظ اور الفاظ کا مناسب استعمال۔ وہ کلاسیکی ادب کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات سے بھی آگاہ تھے۔ پروفیسر سحر انصاری نے ان کی ذات کو قابل تقلید قرار دیا۔ پروفیسر آفاق صدیقی نے ان کے جداگانہ اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں کلاسیکی روایت کا آخری قابل ذکر شاعر قرار دیا۔ جامعہ کراچی کے وائس چانسلر جناب پیرزادہ قاسم نے ان کی شخصیت کی جاذبیت اور اثر انگیزی کے متعلق بتاتے ہوئے ان کی شاعری کو قدیم و جدید اسلوب کا حسین امتزاج قرار دیا۔ اس تقریب کی نظامت نوجوان شاعر سلمان صدیقی نے کی نیز یہ کہ سینئر و معتبر شاعر مسلم شمیم نے تابش دہلوی کو منظوم خراجِ تحسین پیش کیا۔

(رپورٹ: ادارہ)

برطانوی مصنفہ کو ۲۰۰۷ء کا نوبل انعام

برطانوی مصنفہ (ناول نگار) کو اس سال کے ادب کے نوبل پرائز سے سرفراز کیا گیا ہے۔ ستاسی سالہ ڈورس لیسنگ Doris Lessing عالمی سیاست، عورتوں کے مساویانہ حقوق، نسلی امتیاز، جنگوں کے مہلک اثرات اور رہنماؤں کی غلط پالیسیوں کے نتائج کے بارے میں مخصوص نظریات کی حامل ہیں اور اپنی آرا دوٹوک اظہار کرتی ہیں انھوں نے کئی ناول لکھے۔ ناول داگراس ازسنگنگ "THE GRASS IS SINGING" معنویت سے بھرپور ہے۔

انجمن کی مطبوعات

نام کتاب	مصنف	قیمت
۱۔اردو ناول کے چند اہم زاویے	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	160/-
۲۔سرسید احمد خاں، حالات و افکار	بابائے اردو مولوی عبدالحق	75/-
۳۔افکار عالیہ	خان رشید/قاضی قیصر الاسلام	130/-
۴۔ملت اسلامیہ	علی نواز میمن/صفوت قدوائی	250/-
۵۔غالب کے چند پہلو	شمس الرحمٰن فاروقی	100/-
۶۔پاکستان ایک اشرافی ریاست کی معیشت	ڈاکٹر عشرت حسین	480/-
۷۔انجمن ترقی اردو کا المیہ	بابائے اردو مولوی عبدالحق	75/-
۸۔منتشر یادیں	نورالحسن جعفری	150/-
۹۔اردو کی منظوم داستانیں	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	350/-
۱۰۔غالب کی بعض تصانیف	کالی داس گپتا رضا	120/-
۱۱۔تاریخ انجمن بابائے اردو کے بعد	شہزاد منظر/تکملہ: ادیب سہیل	175/-
۱۲۔اشاریۂ اردو (جلد دوم)	مصباح العثمان	100/-
۱۳۔تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت (جلد اول)	سید ہاشمی فرید آبادی	250/-
۱۴۔تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت (جلد دوم)	سید ہاشمی فرید آبادی	300/-
۱۵۔غالب ایک مطالعہ	ممتاز حسین	150/-
۱۶۔غالب درونِ خانہ	کالی داس گپتا رضا	350/-
۱۷۔اردو ادب کی جستجو	رالف رسل	350/-
۱۸۔مقالات مرزا محمد سعید	شیما مجید	125/-
۱۹۔جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری	ڈاکٹر ناہید قاسمی	400/-
۲۰۔غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ	خلیق انجم	350/-
۲۱۔نقش ہائے رنگ رنگ	مترجم: ڈاکٹر صابر آفاقی	250/-
۲۲۔جدید اور مابعد جدید تنقید	ناصر عباس نیر	300/-
۲۳۔مجنوں گورکھپوری حیات و فن	ڈاکٹر عبدالستار نیازی	400/-
۲۴۔ممتاز حسن احوال و آثار	فرزانہ ناہید گیلانی	225/-
۲۵۔پاکستان میں اردو دوہے کی روایت	کنول ظہیر	250/-
۲۶۔اردو افسانے کے فروغ میں ساقی کا کردار	ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز	350/-
۲۷۔متنی تنقید	ڈاکٹر خلیق انجم	300/-
۲۸۔حرفے چند (جلد چہارم)	جمیل الدین عالی	250/-
۲۹۔ندائے دوست	شباہت علی خان	175/-

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال کراچی۔۷۵۳۰۰

بابائے اردو مولوی عبدالحق، حیات اور علمی خدمات

از

شہاب الدین ثاقب

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی مفصل حیات اور زبان و ادب کے سلسلے میں کی
جانے والی ادبی خدمات کا ایک تحقیقی جائزہ

شہاب الدین ثاقب نے اس وقیع کام کو پوری تندھی سے سرانجام دیتے ہوئے بابائے اردو
کا نہ صرف مرقع پیش کیا ہے بلکہ اُن کی علمی و ادبی خدمات کو ایک جامع حیثیت میں بھی مرتب کیا ہے۔
بابائے اردو شناسی میں یہ کتاب اہلِ علم کے لیے ایک نادر تحفہ ہے۔

قیمت ۴۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

بیاضِ مراثی

اشاعت دوم

گیارہویں، بارہویں صدی ہجری کے مراثی کا مجموعہ

مرتب: افسر صدیقی امروہوی

صفحات: ۲۷۰ قیمت: ۷۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

Regd M. No. 270

Phone: 4811406

Monthly **QAUMI ZABAN** Karachi

انجمن کی مجوزہ عمارت کا نقشہ

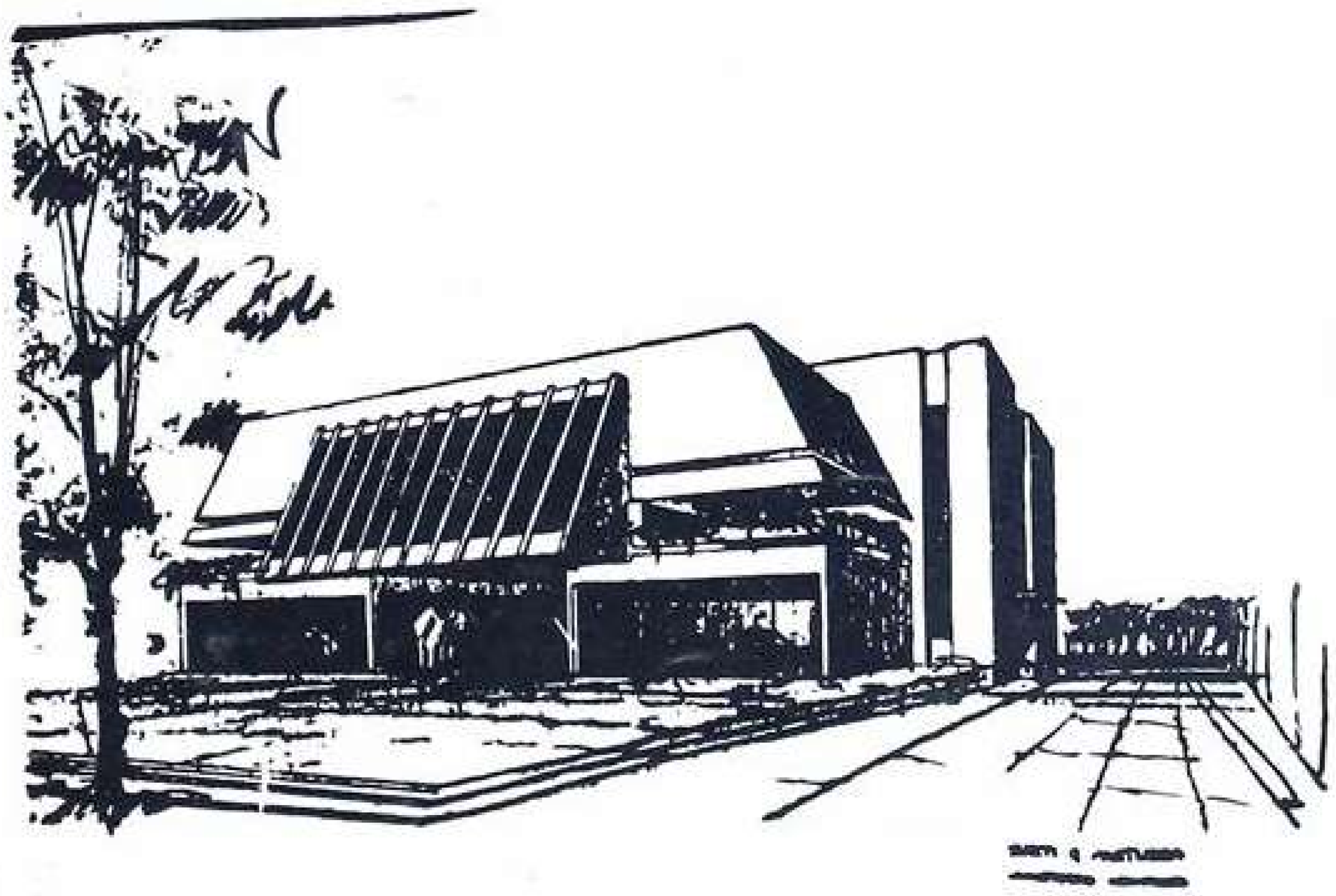

ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

ڈاکٹر ممتاز احمد خان، مدیر قومی زبان، نے انجمن ترقی اردو پاکستان (ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی) کے لیے احمد برادرز، ناظم آباد، کراچی سے شائع کیا۔